ISSN-L 2702-1858
PRINT ISSN 2702-1858
ONLINE ISSN 2702-1378

سہ ماہی

آثار

مجلہ
برائے
آثاریاتی تاریخی مطالعہ

شمارہ۴جلد۲ (اکتوبر تا دسمبر)۲۰۲۱ء

یکے از مطبوعات اساس

ISSN-L 2702-1858
PRINT ISSN 2702-1858
ONLINE ISSN 2702-1378

سہ ماہی

آثار

مجلہ
برائے
آثاریاتی تاریخی مطالعہ

شمارہ۴جلد۲ (اکتوبر تا دسمبر)۲۰۲۱ء

یکے از مطبوعات اساس

آثار (مجلہ برائے آثاریاتی تاریخی مطالعہ)، اساس قریے اور راہیں تحقیقی محرک (روڈز اینڈ ریلیجنز ریسرچ انیشیٹو) کے تحت شائع ہونے والا انجمن برائےآثاریاتی مطالعہ(اساس) کا علمی وتحقیقی مجلہ ہے۔ یہ ایک غیر تجارتی مجلہ ہے جس میں شائع ہونے والی ماہرین سے نظرِ ثانی شدہ تمام تحریرات بشمول ہر قسم کے خاکوں, تصویری اور نقشہ جاتی مواد اور معلومات محض ادارہ اساس کی ملکیت ہیں جو تحریر, مواد ،حالت اور ہیت میں تبدیلی کئے بغیر اور مجلہ هذا اور تحریر کنندہ / کنندگان کا مکمل حوالہ دے کرہی استعمال کئے جاسکتے ہیں(سوائے اس کے کہ کسی تحریر یا دیگر مواد کے بارے میں الگ سے نشاندہی کر دی جائے)۔ مجلہ برائے آثاریاتی تاریخی مطالعہ (آثار) کی جملہ انتظامیہ بشمول مدیران، مجلہ میں شائع ہونے والے تحقیقی کام کے مصنفین،محققین یاان کے معاونین اور شریک مصنفین کی تحقیق، افکار و خیالات اور تحقیقی نتائج کے ہرگز ذمہ دار نہیں۔تحریرات اور مواد کے اشاعتی حقوق پورے کرنا اور اس ضمن میں علمی سرقہ سے اجتناب صرف اور صرف تحریر کنندہ کی ذمہ داری ہے نہ کہ مجلہ کی انتظامیہ کی اور اس ضمن میں ادارہ سے کوئی بھی شکایت ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگی۔ کسی بھی نوعیت کےمروجہ قوانین یا علمی قواعد و اخلاقیات کی خلاف ورزی کا واحد ذمہ دار مصنف /تحریر نگار خود ہوگا۔

JAHS (Journal of Archaeohistorical Studies or آثار) is a research organ of Association for the Archaeological Study of Ancient Societies (*ASAS*), published under the auspices of Roads and Religions Research Initiative. All peer-reviewed material, written or visual, including all types of sketches, illustrations, maps, and information is the sole property of the *ASAS* and may be used without modification of the text, materials, and content and with full reference to the magazine and the author/s(Unless otherwise stated). The entire management of *ASAS* including the editorial team of the *Journal of Archaeohistorical Studies* is not responsible for the ideas, research, and research findings of the authors, researchers, or their assistants or co-authors published in *JAHS (AAsAAr)*. It is the Author's responsibility to ensure that the submitted content is original. Any violation in this regard will be considered the author's misconduct. The author/s will be solely responsible for any violation of the prevailing laws, accepted scientific norms, or ethics, and *JAHS* or *ASAS* management could not be held responsible before any court of law or any other forum or body.

Published in 2021 by *ASAS* Roads and Religions Research Initiative for Association for the Archaeological Studies of Ancient Societies, Punjab Pakistan.

JAHS (آثار)
Journal of Archaeohistorical Studies
ISSN-L 2702-1858
PRINT ISSN 2702-1858
ONLINE ISSN 2702-1378
Volume 2, Issue 4 | December 2021
Published for *ASAS* by (Dilawar Hussain)
Im Kirchacker 976879 Hochstadt Rheinland-Pfalz Germany
Print by *ASAS*
For inquiries please contact: Muzaffar Ahmad, Executive Editor
archeohistorian@gmail.com
executiveeditor@aasaar.org
Journal e-mail: editor@aasaar.org
Web: www.aasaar.org , www.roadsandreligions.org
Legal Advisor: Nasir Zaman Chaudhry

This is an open-access journal. Any original, previously unpublished content is licensed under the Creative Commons Attribution 4.0 International License.
To view a copy of this license, please visit creativecommons.org/licenses/by/4.0.

اساس قریے اور راہیں (اقرا) تحقیقی محرک

اساس ماہرین آثاریات کا تحقیقی فورم ہے جو ۲۰۱۲ء سے علمِ آثاریات اور اس کی تدریس و تحقیق میں بنیادی تصوراتی تبدیلیوں کے لئے اپنا کردار عملی اقدامات اور درست تصورات متعارف کروا کر ادا کر رہا ہے۔ اساس کے عملی منصوبہ جات کا مقصد محدود پیمانے پر آثاریاتی ماہرین، اساتذہ اور طلباء کی سوچ میں ایک مفیدتبدیلی پیدا کرنا ، اس پر محدود پیمانے پر عملدرآمد کرکے دکھانا، درست مشاورت مہیا کرنا، بنیادی آثاریاتی عملی ہنر سکھانا اور اس کے لئے ممکنہ سہولیات مہیا کرنا ہے۔ اساس کے حاصل شدہ اہداف کی ایک طویل فہرست میں متعدد ورکشاپس کا انعقاد، عملی آثاریاتی ٹریننگ مہیا کرنا ،آلات اور اوزاروں کی فراہمی، بنیادی عملی آثاریاتی لائحہ عمل (فیلڈ مینول) کی اشاعت اور ملکی سطح پر ایک آرکیالوجِکل ایسوسی ایشن کا تحریری تصور پیش کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ حالیہ برسوں میں اساس کے فورم نے پاکستانی آثاریات میں انگریزی میں تحقیق نگاری کی پابندی کو چیلنج کیا ہے۔ نوآموزپاکستانی ماہرینِ آثاریات کی ایک بڑی تعداد کے ذہن میں جو کچھ چلتا ہے اس کے فصاحت اور درستگی سےضابطۂ تحریر میں نہ آسکنے میں انگریزی نویسی کا بنیادی کردار ہے۔ اساس کا ماننا ہے کہ آثاریات کاانگریزی سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ اس نظریہ کے تحت اردو میں آثاریاتی تحقیق نگاری کا کامیاب آغاز کر دیا گیا ہے۔ انگریزی میں لکھنا بہت اچھی بات ہے اور جملہ پاکستانی قومی زبانوں میں لکھنا اور بھی اچھی بات۔

گذشتہ اہداف کے مفید پہلوؤں کو سمیٹ کر یکجا کرنے اور اردو آثار نویسی کے فروغ کےلئے گذشتہ برس اساس کےپلیٹ فارم سے *ASAS Roads and Religions Research Initiative* یا ***اساس قریے اور راہیں تحقیقی محرک*** کے جامع منصوبہ کی صورت میں ایک دور رس نتائج کا حامل اور مختصر الاہداف منصوبہ پیش کیا گیاہے۔ زمانہ قبل از تاریخ سے ہی قدیم انسانی بستیاں، ان کو ملاتے راستے ، ان کی راہوں پر سرگرداں انسان ، ان میں بستے لوگ اور ان میں فروغ پاتی متنوع مذہبی تمدنی سرگرمیاں آثارِ قدیمہ، تاریخ، موازنہ مذاہب اور مذہبی آثاریاتی سیاحت کے جدید تصورات کی اساس ہیں۔ ماہرینِ آثاریات پر ان کو درست طریق پر برآمد کرنا، سمجھنا، تحقیق کے عمل سے گزارنا اور تحقیقی نتائج کی اشاعت لازم ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئےاساس آثاریاتی فورم کے تحت ایک ورثہ گھر (ہیریٹیج سنٹر) ایک ویب اور ایک تحقیقی جریدے کااجرا ءکیا جارہا ہے۔ **آثار (مجلہ برائے آثاریاتی تاریخی مطالعہ)** کا یہ پہلا شمارہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

آثار غیر تجارتی بنیادوں پر جاری ہونے والاپہلا آثاریاتی تاریخی جریدہ ہے جس میں آثاریاتی تاریخی تحقیق اور دیگرمتعلقہ علوم پر تحریر کی جانے والی تحقیقات بھی شائع کی جائیں گی۔ اساس کا ادارہ اس ضمن میں سب ماہرینِ آثاریات سے تعاون کا خواستگار ہے۔ اساس کے نظریہ کے مطابق منظور شدہ جرنل کی منزل تک پہنچنے کی چند برسوں سے جاری دوڑ میں شامل ہونا اس جریدے کے لئےضروری نہیں۔ کیونکہ یہ جدّت صرف پاکستان اور بھارت میں وجود رکھتی ہے۔ ہاں اس جریدے کا معیار منظور شدہ جریدوں کے برابر اور ان میں سے بہت سوں سے بہتر ہو یہ ہمارے لئے ازحد ضروری ہے۔ اس علمی جریدے میں مضامین آثاریات اور تاریخ کے ماہرین کی نظرِ ثانی کے بعد شائع کئے جاتے ہیں۔ اور علمی اشاعت کے بین الاقوامی معیار کی ممکنہ حدّ تک پاسداری بھی کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

Executive Editor
Muzaffar Ahmad
PhD Scholar (Hazara University)
MPhil Archaeology (Hazara University)
MA Archaeology(Gold Medallist), University of Peshawar
Founding President ASAS (Association for the Archaeological Study of Ancient Societies)
Roads and Religions Research Initiative

Editors

Naveed Ahmad Raza

MA Archaeology (PU)
MA History (PU)
BA History (PU)

Abdul Ghani Khan
MA Archaeology(Gold Medallist), (HU)
MPhil Archaeology (HU)
PhD Scholar (HU)
Part of Archaeological research team in the Leiden University

Waheed Alam Khan
MA Archaeology (HU)
MPhil Archaeology (HU)

Editorial Board

Muhammad hasan Khokhar
M A History (with Archaeology)
Deputy Director Archaeology, Punjab (Lahore Fort)
Former Curator, Harappa Museum

Dr. Muhammad Zahir
Ph.D. Archaeology, University of Leicester (UK)
MA (Gold Medallist), University of Peshawar
BSc (The University of Peshawar)
Visiting Fellow, Ancient India and Iran Trust-Cambridge
Aman Fellow - Harvard University, USA
Correspondent Fellow - IsMEO, Italy
Affiliate Researcher, Max Planck

مدیر مسئول

مظفر احمد
پی ایچ ڈی سکالر (ہزارہ یونیورسٹی)
ایم فل آثاریات (ہزارہ یونیورسٹی)
ایم ۔اے آثاریات (پشاور یونیورسٹی) طلائی تمغہ یافتہ
بی۔ اے تاریخ (پنجاب یونیورسٹی)
بانی صدر ایسوسی ایشن فار دی آرکیالوجکل سٹڈی آف اینشیئنٹ-سویز اورروڈز اینڈ ریلیجنز ریسرچ انیشی ایٹو

مدیران

نوید احمد رضا
ایم اےآثاریات(پنجاب یونیورسٹی)
ایم اے تاریخ (پنجاب یونیورسٹی)
بی اے تاریخ (پنجاب یونیورسٹی)

عبدالغنی خان
ایم اےآثاریات(ہزارہ یونیورسٹی) طلائی تمغہ یافتہ
ایم فل آثاریات (ہزارہ یونیورسٹی)
پی ایچ ڈی سکالر (ہزارہ یونیورسٹی)
ممبر آرکیالوجکل ریسرچ ٹیم لیڈن یونیورسٹی ، ہالینڈ

وحید عالم خان
ایم اےآثاریات(ہزارہ یونیورسٹی)
ایم فل آثاریات (ہزارہ یونیورسٹی)

ادارتی بورڈ

محمد حسن کھوکھر
ایم اے تاریخ و آثاریات(پنجاب یونیورسٹی)
ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ آثارِ قدیمہ پنجاب (قلعہ لاہور)
سابق کیوریٹر ہڑپہ میوزیم

ڈاکٹر محمد ظاہر
پی۔ ایچ ۔ڈی آرکیالوجی، یونیورسٹی آف لیسسٹر (یو۔کے)
ایم۔اے آرکیالوجی (پشاور یونیورسٹی) - طلائی تمغہ یافتہ
بی۔ ایس۔ سی (پشاور یونیورسٹی)
وزٹنگ فیلو، قدیم ہند وایران ٹرسٹ۔ کیمبرج
امان فیلو، ہارورڈ یونیورسٹی ، ریاست ہائے

Institute for the Science of Human History - Jena – Germany
Associate Professor,
Department of Archaeology
(HU)

-متحدہ امریکہ
کارسپانڈنٹ فیلو IsMEO اٹلی
وابستہ محقق میکس پلینک انسٹیٹیوٹ
برائے۔ علمِ تاریخِ انسانی ۔ جینا۔ جرمنی
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ آثاریات (ہزارہ
-یونیورسٹی)

Muhammad Hameed
Ph.D. Archaeology (Freie Universität Berlin)
MA Archaeology (Punjab University)
BA (Punjab University)
Associate Professor Department of archaeology, Punjab University
Chairman Department of Archaeology(University of Punjab)

ڈاکٹر محمد حمید
پی ایچ ڈی (فری یونیورسٹی برلن، جرمنی)
ایم ۔اے آرکیالوجی (پنجاب یونیورسٹی)
بی۔اے پنجاب یونیورسٹی
ایسوسی ایٹ پروفیسر وصدرشعبہ آثاریات
پنجاب یونیورسٹی

Dr. Mirza Naseer Ahmad

M.Sc Geophysics (Quaid-I-Azam University)
Ph.D (Hokkaido University, Japan)
Post Doc. (Chulalongkorn University, Thailand)
Projects supervisor for MS Students Program, (Chulalongkorn University)
HoD Earth Sciences Department at Abdus Salam School of Sciences(Nusrat Jahan College-Rabwah)
Member, Society of Exploration Geophysicist (SEG). Member of Pakistan Association of Petroleum Geoscientists (PAPG).

ڈاکٹر مرزا نصیر احمد
ایم ایس سی جیوفزکس
پی ایچ ڈی (ہوکائڈو یونیورسٹی ، جاپان)
پوسٹ ڈاک (چولالونگ کوم یونیورسٹی، تھائی لینڈ)
پراجیکٹ سپروائزر برائے ایم ایس طلباء پروگرام (چولالونگ -کورن یونیورسٹی، تھائی لینڈ)
صدرشعبہ علومِ ارضی ، عبدالسلام اسکول آف سائنسز، نصرت۔ جہاں کالج ، ربوہ (چناب نگر)
ممبر سوی فار ایکسپلوریشن جیوفزسٹ(ایس ای جی)

Mian Attique Ahmad
MA, History (Archaeology)
FRAS (London)
Ex-Director Lyallpur Museum
Director Punjab Arts & Crafts Museum (PUCAR) Information & Culture Department Government of Punjab

میاں عتیق احمد
ایم اے تاریخ وآثاریات (پنجاب یونیورسٹی)
ایف۔آر۔اے۔ایس (لندن)
ڈائریکٹر لائل پور میوزیم
سابق ڈائریکٹر پنجاب عجائب گھر برائے فنون و- ہنر(PUCAR)، شعبہ معلومات وثقافت، حکومتِ پنجاب

Dr. Ijaz Khan
BA (University of Peshawar)
MA, Archaeology (University of Peshawar)
Ph.D. The University of Leicester (UK)
Lecturer Ancient Civilisations (Abdul Wali Khan University, Mardan)
Curator, F. A. Durrani Museum

ڈاکٹر اعجاز خان
بی اے(پشاور یونیورسٹی)
ایم اے آثاریات(پشاور یونیورسٹی)
پی. ایچ .ڈی یونیورسٹی آف لیسسٹر (یو۔کے)
لیکچرار اینشنٹ سولائزیشنز (عبدالولی خان یونیورسٹی -مردان)

(Abdul Wali Khan University)

کیوریٹر، ایف اے خان درّانی عجائب
گھر(عبدالولی خان -یونیورسٹی)

Mehir Rahman
BA (University of Peshawar)
MA (University of Peshawar)
MPhil (Hazara Universtiy, Mansehra)
Hazara University Museum

مہرالرحمان
بی اے پشاور یونیورسٹی
ایم اے آثاریات پشاور یونیورسٹی
ایم فل آثارِ قدیمہ ہزارہ یونیورسٹی
ہزارہ یونیورسٹی میوزیم

Sheikh Atif Ali (Representatiive for Sindh)

شیخ عاطف علی نمائندہ برائے آثاریاتی امور سندھ

Authours

Dr. Saifurr Rehman Dar (T.I)
PhD. Archaeology, Aristotaleon University, Salonica (Greece)
Former Director, Lahore Museum
Former Director General Department of Archaeology, Govt. of Punjab
Former faculty member, Department of Archaeology, University of the Punjab, Lahore
srdar39@gmail.com

Dr. Muhammad Rafique Mughal (T.I)
Professor Emeritus of Archaeology
Ph.D. Archaeology, University of Pennsylvania (USA)
Former Director General Department of Archaeology and Museums, Govt. of Punjab
xmughal@yahoo.com

Dr. Tahir Saeed Ph.D.
Deputy Director, Department of Archaeology and museums, Islamabad
t_saeed2000@hotmail.com

Muzaffar Ahmad
PhD Scholar (Hazara University)
MPhil Archaeology (Hazara University)
MA Archaeology(Gold Medallist), University of Peshawar
archeohistorian@gmail.com

Fazal Muhammad
Hazara Cultural Museum, Department of Archaeology, Hazara University
MA Archaeology (UoP)
MPhil Archaeology (HU)
fazalarch@gmail.com

Navid Ahmad
BS Archaeology(HU)
navidahmad526@gmail.com

Sumbal Imtiaz
BS Archaeology (HU)
sumbalnavidzooni@gmail.com

Waheed Alam
Sub-Regional Office Malakand Region at Swat Museum
BS, MPhil Archaeology (HU)
walam0883@gmail.com

Sirat Gohar Daudpoto
Consultant Cultural Historian
National Institute of Folk & Traditional Heritage-Lok Virsa
siratgohar@gmail.com

Sheikh Atif Ali BA (Tedo Adam)
sshaikhatifali@gmail.com

مضمون نگار

ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار (تمغہ امتیاز)
پی. ایچ .ڈی آرکیالوجی، ایرسٹوٹلین یونیورسٹی، سالونیکا (یونان)
سابق ڈائریکٹر لاہور عجائب گھر، پاکستان
سابق ڈائریکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ حکومت ,پنجاب
سابق استاد شعبہ آثاریات، پنجاب یونیورسٹی لاہور
srdar39@gmail.com

ڈاکٹر محمد رفیق مغل (تمغہ امتیاز)
پروفیسر ایمیریٹس آف آرکیالوجی
پی. ایچ .ڈی آرکیالوجی، یونیورسٹی آف پینسلوینیا (یو.ایس.اے)
سابق ڈائریکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ و عجائب خانہ جات،
حکومت پاکستان
xmughal@yahoo.com

ڈاکٹر طاہر سعید پی ایچ ڈی
ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ آرکیالوجی و عجائب خانہ جات، اسلام آباد
t_saeed2000@hotmail.com

مظفراحمد
پی ایچ ڈی سکالر (ہزارہ یونیورسٹی)
ایم فل آثاریات (ہزارہ یونیورسٹی)
ایم .اے آثاریات (پشاور یونیورسٹی) طلائی تمغہ یافتہ
بی. اے تاریخ (پنجاب یونیورسٹی)
archeohistorian@gmail.com

فضل محمد
ایم اے آثاریات، پشاوریونیورسٹی
ایم فل آثاریات، ہزارہ یونیورسٹی
ہزارہ ثقافتی عجائب گھر، شعبہ آثاریات، ہزارہ یونیورسٹی
fazalarch@gmail.com

نوید احمد
بی ایس آثاریات (ہزارہ یونیورسٹی)
navidahmad526@gmail.com

سنبل امتیاز
بی ایس آثاریات (ہزارہ یونیورسٹی)
sumbalnavidzooni@gmail.com

وحید عالم
سب ریجنل آفیسر مالاکنڈ ریجن، سوات عجائب گھر
بی ایس آثاریات، ہزارہ یونیورسٹی
ایم فل آثاریات ہزارہ یونیورسٹی
walam0883@gmail.com

صراط گوھر دائودپوٹو
کنسلٹنٹ ثقافتی مؤرخ، نیشنل انسٹیٹیوٹ آف فوک اینڈ ٹریڈشنل ہیریٹیج۔ لوک ورثہ
siratgohar@gmail.com

شیخ عاطف علی بی اے(ٹیڈو اڈم)
sshaikhatifali@gmail.com

Contents

1. Editorial
Mobility on scale; Towards recreating horizons of ancient mobility profiles……………………………………….13

2. The Arabic inscription of king Ashama in Negash-Ethiopia: an inscriber who doesn't know Arabic.….18
Zakaria Mohammed

3. Development of Arabic Script in First Century After Hijra……………………………………………………………...24
Muzaffar Ahmad

4. Archaeology of Kashmir; from Mauryan Occupation to Local Rajas……………………………………………………….... 43
Asia Maryam

5. Saint Thomas in Taxila, Possibilities and Realities ……………………………………………………………. 56
Muzaffar Ahmad

6. Concept Proposal for Cholistan Heritage Museum at Islamia University Bahawalpu…………………………… 62
Dr Mohammad Rafique Mughal

7. Professor Ahmad Hasan Dani, Archaeologist, Anthropologist, Historian and Epigraphist Par Excellence ………………………………………………………. 68
Dr Saifur Rahman Dar

8. Context of Moulded Pottery from Depar Ghangro: A Buddhist Site in Sindh…………………………………. 100
Dr Mohammad Rafique Mughal

A study of Buddha Image in the Light of Early Buddhist Texts………………………………………………………………..106
Dr Tahir Saeed

Boo Review
Wall Paintings of Sindh by Zulfiqar Kalhoro…….113
Sirat Gohar Daudpoto

Habbarid Rulars of Mansurah in the light of their Coinage……………………………………………………….…117
Abdullah Khan Wariya (Late), Urdu Translation by Sheikh Atif Ali

Biological and Environmental Threats to Heritage: A case study of Sultan Mehmud Khurd Tomb at Guli Bagh, Mansehra, KP, Pakistan…………………………….…128

Fazal Muhammad, Waheed Alam and others

فہرست

۱ ادار یہ
قدیم مسافتوں اور منازل کے پیمائشی نقشہ جات اور کمپیوٹر پروگرامنگ (ص ۱۳)

۲ **نقش الملك النجاشي الشهير أصحمة** (ص ۱۸)
زکریامحمد

۳ عربی رسم الخط کاارتقاء پہلی صدی ہجری میں (ص ۲۴)
مظفر احمد

۴ کشمیر کے آثار قدیمہ موریہ غلبے سے مقامی راجاؤں تک (ص ۴۳)
آسیہ مریم

۵ شاگرد تھوما کی ٹیکسلا آمد کا معاملہ امکانات اور واقعات کی روشنی میں (ص ۵٦)
مظفر احمد

٦ جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں چولستانی آثاریاتی ورثہ کے عجائب گھر کے قیام کی تصوراتی تجویز (ص ٦۲)
ڈاکٹر محمد رفیق مغل

۷ پروفیسر احمد حسن دانی، ماہر آثاریات، عالم بشریات، مؤرخ اور بہترین ماہر کتبات (ص ٦۸)
ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار

۸ دیپر گھانگرو کے مولڈڈ ظروف (ص ۱۰۰)
ڈاکٹر محمد رفیق مغل

ابتدائی بدھ متون کی روشنی میں بدھا کی صورت گری کا مطالعہ (ص ۱۰٦)
ڈاکٹر طاہر سعید

تبصرہ کتب۔ وال پینٹنگز آف سنڈ (ص ۱۱۳)
صراط گوهر دائودپوٹو

منصورہ کے ھباری حکمران سکوں کی روشنی میں
عبداللہ خان وریا مرحوم، اردو ترجمہ -شیخ عاطف علی (ص ۱۱۷)

آثاریاتی ورثہ کو لاحق حیاتیاتی اور ماحولیاتی خطرے (ص ۱۲۸)
مقبرہ سلطان محمود خورد واقع گُلی باغ، مانسہرہ، پاکستان کا تحقیقی مطالعہ
فضل محمد، وحید عالم اور دیگر

اکابرین آثاریات پاکستان

اداریہ

قدیم مسافتوں اور منازل کے پیمائشی نقشہ جات اور کمپیوٹر پروگرامنگ

Editorial:
Mobility on scale
Towards recreating horizons of ancient mobility profiles

> Landscape is time materialized. Or, better, landscape is time materializing: landscapes, like time, never stand still.
> (Bender 2002)
>
> The routine practices in the landscape thus have structuring effects, which can be seen in the material record. As people move around in their daily practices, they make landscapes and make time go on.
> (Dimitrij Mlekuz 2014)

تحرّک یعنی موبِلٹی capacity and need for movement from place to place ہے۔(گوری اور ساتھی:۲۰۱۸ء ص ۲) راستے تحرک طلبی کی پیداوار ہیں اور تحرّک طلبی جانداروں کا ایک ایسا وصف ہے جس میں سے انسان نے بھی بہت حصہ پایا ہے۔ انسانی تحرک طلبی اس کی رہائش گاہ کے اندرونی راستوں سے شروع ہو کر پگڈنڈیوں، گلیوں کوچوں، سڑکوں شاہراہوں، بحری اور فضائی اور خلائی راستوں کے ایک جال (نیٹ ورک) پر جب سے وہ حیاتیاتی طور پر حرکت کے قابل ہوا ہے جاری ہے اور متواتر وسعت پذیر ہے۔ اس انسانی تحرّک کا آثاریاتی پہلو ماضی میں اس تحرّک کے زمانی منظرناموں کی ترتیب وار تشکیل ہے جو مادی آثار، گذشتہ تحریری بیانات اور سائنسی شواہد کی روشنی میں ہی مرتب کی جاسکتی ہے۔

ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرنے کے محرّکات حرکت کی مقصدیت اور سمت کا تعین کرتے ہیں۔ نقطہ آغاز سے عارضی یا مستقل منزل (یا منزلوں) تک حرکت سفر ہے جو عارضی یا مستقل قیام پر منتج ہوتا ہے۔ منزل سے منزل تک یہ سفر نقاطِ سفر کو باہم ملانے والے ان فرضی خطوط کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے جنہیں کاغذ یا سکرین پر دکھایا جاسکتا ہے۔ یہ سفر خانہ بدوشانہ ہو، مقیم آبادی کا روزمرہ سفر یا تلاش روزگار، تجارت و سیاحت یا طلب علم وغیرہ کی خاطر اختیار کیا جانے والا سفر وغیرہ، ان سب صورتوں میں اس سفر کی ایسی خاکہ کشی کی جاسکتی ہے جس میں منازل کے درمیان دکھائے گئے سفری خطوط ارضی خدّوخال کی پیروی کرتے ہوں۔

موجودہ دور میں ہزاروں نقاط سے ہزاروں نقاط کے اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے خاکے مرتب کئے گئے ہیں لیکن نہ تو یہ خاکے جامع ہیں اور نہ ان کے پس پردہ کوئی علمی نظریہ موجود ہے۔ مقامِ رہائش کے داخلی تحرّکی تعلقات، مجموعہ رہائش (آبادی) کے تحرّکی تعلقات، ہمسایہ بستیوں کے باہم تحرّکی تعلقات، بستیوں اور شہری آبادیوں کے باہمی تحرّکاتی تعلقات اور بین الاقوامی تحرّکاتی تعلقات کے scaled نقشے الگ الگ اور مجموعی طور پر تجریدی اور حقیقی دونوں طرح سے تشکیل دیئے جاسکتے ہیں۔ یہ سکیلڈ نقشے اس اصول پر تشکیل پائیں گے کہ **دنیا میں سب منازل ایک تحرّکی جال(mobility net) میں باہم مربوط ہیں** جو برّی، زیرزمین برّی و پہاڑی، نہری، دریائی، بحری، فضائی اور خلائی جہات کا حامل ہے۔ اسے اصول تحرّک کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ اصول انسانی تحرّک کے دیگر ملتے جلتے جغرافیائی سائنسی اصولوں سے اس لحاظ سے فرق ہے کہ یہ انسانی تحرک کو آثاریاتی تاریخی طور پر ڈاکومنٹ کرنے کی نظریاتی اساس ہے نہ کہ انسانی تحرک کی سائنسی و شماریاتی مقاصد کے تحت ماڈلنگ کے لئے وضع کیا کوئی اصول۔ اس اصول کی بنیاد پر ایک ایسا سافٹ ویئر ڈیزائن کیا جاسکتا ہے جو صرف کرہ ارض کے ارضی، آبی، فضائی اور خلائی راستوں کو ارضی جغرافیائی خدوخال کے حامل ایک نقشے میں تین جہاتی طور پر ایڈٹ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یعنی ایک ایسا جدید نقشہ اس سافٹ ویئر کی اساس ہو جس میں مجوزہ mobility net کے تمام ممکنہ جغرافیائی، فضائی اور خلائی رستے پہلے سے ہی موجود ہوں اور اس سافٹ ویئر کی مدد سے حسب ضرورت اس mobility net کے مطلوبہ دھاگوں(strands) کو نمایاں کرکے حسب ضرورت ایڈٹ کیا جاسکے۔ ایسے کسی سافٹ ویئر میں جس میں تحرّکی جال کے جملہ دھاگچوں اور دھاگوں کو ایڈٹ کرنے کی سہولت اور اس کے لئے

درکار آپشن موجود ہوں گے نہایت کامیابی کے ساتھ انسانی سفر کی آثاریاتی تاریخی مادی تشکیل کے لئے استعمال کیا سکے گا اور ہر سطح پر راستوں کو ان کی جامعیت میں مطالعہ کیا جاسکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ اس معاملے کو کچھ گہرائی میں جاکر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

انسانی تحرّک کی آثاریاتی اہمیت کو کئی دہائیوں سے محسوس کیا جارہا ہے اور ماہرین آثاریات نے اس ضمن میں کچھ نہ کچھ لٹریچر بھی پیدا کیا ہے۔ The Archaeology of Mobility;Old World and New World Nomadism کے نام سے ہانس برنارڈ اور ویلّیک وینڈرخ نے ۲۰۰۸ء میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سے ایک مجموعہ مضامین ایڈٹ کرکے شائع کیا۔ اس کتاب کو خانہ بدوشانہ تحرک تک ہی محدود رکھا گیا ہے اور مستقل مقیم آبادیوں کا بامقصد تحرّک بالعموم اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ مدیران کے نزدیک انسان نے وقت اور وسعت ارضی دونوں میں بہت سی وجوہات کی بناپر بہت سے راستوں پر سفر کیا (۲۰۰۸ء ص ۱)۔

مندرجہ بالا مجموعہ مضامین کی نسبت Ex Novo Journal of Archaeology نے Human Moblility in Archaeology (۲۰۱۸،۳ء) کے نام سے جو تحقیقاتی نمبر شائع کیا گیا ہے اس میں زیادہ بہتر طور پر نقاطِ منازل اور سفر کی آثاریاتی تاریخ ماہیئت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ Maja Gori، Martina Revello اور Alessandro Pintucci نے کتاب کے افتتاحیہ میں جامیعت سے معاملے کی نوعیت پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> Every society experiences movement. As a structural component of human behavior and human mind, movement necessarily influences our ways of thinking, our relationship with people, space, time, and traditions; it modifies how we organize as groups, our perception of things and the way in which we interact with them. For its role in shaping societies, mobility has been at the core of archaeology since its inception as a discipline. Throughout archaeology's history, key topics focusing on the movement of people have included, among others: migration and diffusion; identity; invasion, conquest, and imperial imposition; colonialism; trade and the movement of goods, people, and animals; seafaring and its associated technologies; resource acquiring practices; nomadism. However, especially following the processual turn, scholars tended to minimize the impact of movement on human history placing instead major emphasis on theories about culture and its inherent mutability (e.g. Trigger 1989, Anthony 1990). As a result, despite decades of research into the nature of mobility by anthropologists, sociologists and geographers along with the most recent and sometimes controversial contributions of hard sciences – mainly strontium (Sr) and oxygen (O) isotope analysis, and aDNA analyses (on aDNA see Vander Linden 2016, Furholt 2018 and the controversial connection between cultural and biological identities in Lazaridis et al. 2017) – much archaeological debate seems still to revolve around two polarizing positions: those using movement as all-in-one explanatory device, and those that downgrade its role as active agent in triggering change (Gori at al.2018:1).

موبلسٹس یعنی انسانی تحرک کو آثاریات میں اہمیت دینے والوں اور امبولسٹس یعنی اہمیت نہ دینے والوں کے درمیان جو دراڑ وجود میں آئی اس نے دنیا کے مجموعی آثاریاتی رقبے کے بہت بڑے حصے کو نظرانداز کروادیا (گوری اور دیگرسن ۲۰۱۸ ص ۱)۔ لیکن ایسا مزید نہیں ہونا چاہیے۔ اب وہ وقت ہے جب قدیم انسان کے دانت اور ہڈیاں بتارہے ہیں کہ وہ ماضی میں انفرادی اور گروہی حیثیت میں کن راستوں سے گزرا اور کب کب گزرا۔ انسانی پھیلاؤ کے سائنسی تعین تاریخ اور اس پھیلاؤ کے راستوں کی نشاندہی کے لئے آجکل strontium اور oxygen stable isotope ہر دو کے سائنسی تجزیئے سے مدد لی جاتی ہے۔ گوری اور ان کے ساتھیوں (۲۰۱۸ء ص ۲) کے نزدیک:

> As opposed to other scholars focusing on movement in modern times, archaeologists may provide a way of comprehending not only the interrelationship between physical movement, representations, and mobile practices, but more significantly how the

nature of such interrelationships may vary across wide time spans and contexts. In other words, by providing a view from the past, archaeology may enable us to understand, to use Beudry and Parno words, the *different ways in which mobility has been regulated in different times and places, how this reflects political and social structure, and how differential access to voluntary movement— as well as forced movement* (Beaudry & Parno 2013: 5)

محقق Dimitrij Mlekuz نے Exploring the topography of movement کے نام سے لکھے گئے اپنے تحقیقی مقالے میں نوٹ کیا کہ:

> Movement constitutes landscape; it is an essential act of weaving places into the web of landscape, making it real for the people themselves.
>
> People also carry objects, moving them into new positional and relational contexts with other things, and they create new material encounters and new material traces through movement (Mlekuz 2014:5)
> .

وہ تحرّک کو ریکارڈ کرنے کے لئے ٹائم جیوگرافی کی تھیوری کا فریم ورک تجویز کرتے ہیں جس میں" ٹائم۔ سپیس اکوریم" میں کسی جسم کی پوزیشن اور حرکت کو ریکارڈ کرنے کا تصور پیش کیا گیا ہے جہاں ٹائم سپیس پیٹرن ایجنٹس کے باہمی تعلقات اور روابط کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں(Mlekuz 2014:6)۔ان کے نزدیک:

> …movement is the intertwining of many lines that run concurrently, making it a generative and recursive practice.

اگرچہ ماہرین آثاریات انسانی تحرّک کے آثاریاتی تاریخی مطالعہ میں جامع نقشہ سازی کی ضرورت کا ادراک رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس موجود ماضی کی معلومات اس قدر قلیل اور بکھری ہوئی نوعیت کی ہیں کہ ان کے لئے اس ادراک کی بنیاد پر کوئی ایسا حل تلاش کرنا ممکن نہیں جو جامع نقشہ سازی کی اس ضرورت کو پورا کر سکے۔ ماہرین آثاریات مختلف راستوں اور خطوں میں انفرادی اور اجتماعی مسافتوں اور مسافرتوں کی ڈاکومنٹیشن پر کام کرتے ہیں اور اسے تھیوریٹیکل فریم ورکس کے تحت کرنے میں بھی دلچسپی لیتے ہیں لیکن ایک ایسے ٹول کی غیر موجودگی میں جو کرہ ارض پر انسانی تحرّک کو ایک سکیل پر ڈاکومنٹ کر سکے اور ساتھ کے ساتھ انسانی سفر کے محرّکات کو بھی تناظر بخش سکے باقی ہے۔ اس ضمن میں مناسب ہے کہ Roads to Rome (R2R) نامی پراجیکٹ (۲۰۱۵ء) کے ماہرین کے جو Moovel Lab کے نام سے کام کر رہے تھے اس راہی جال کو منظم و مربوط شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے کارنامے پر کچھ بات کی جائے۔ یہ تصور کہ معلوم کیا جانا چاہیئے کہ کیا واقعی تمام راستے روم سے جڑے ہوئے ہیں Philipp Schmitt اور Benedikt Groß نے پیش کیا تھا۔ پروگرامنگ اور جی آئی ایس میں Raphael Reimann بھی ان کے ساتھ شریک تھے۔ ان کے پیش نظر روم میں رومن فورم سے دریافت ہونے والا وہ ۲۰ قبل مسیح کا کانسی کا سنگ میل تھا جسے سنہری سنگ میل (Milliarium Aureum) بھی کہا جاتا ہے اور جس کے بارے میں یہ مانا جاتا تھا کہ دنیا بھر کے راستوں کے لئے یہ بنیادی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے۔

Milliarium Aureum

26,503,452 مربع کلومیٹر یعنی 10,231,707 مربع میل کی گرد یعنی تمام یورپ پر محیط رقبے میں سے ان ماہرین نے 486,713 نقاط ایسے شناخت کئے جو روم شہر سے جا ملتے تھے۔ پھر ان تمام نکات کو روم سے اور آپس میں ملایا گیا تو راہی جال کے خدوخال نمایاں ہوئے۔اس پراجیکٹ کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا واقعی یہ کہاوت ایک حقیقت ہے کہ تمام سڑکیں روم کی طرف جاتی ہیں۔ پراجیکٹ کا نتیجہ اس کہاوت کی تصدیق کی صورت میں بر آمد ہوا۔ اس پراجیکٹ کا مقصد یہ تھا کہ:

> The aim is to incorporate the aesthetics of art while basing on the principles of real world routing and large scale data processing (2016:37).

The goal of this project was to find an automated way to visualize the proverb (2016:37).

بعد ازاں ۲۰۱۸ء میں اس پراجیکٹ میں شامل Benedikt Groß نے Flights to Rome کے نام سے راہی جال کی ایک اور جہت کی تکمیل کی اور فضائی راستوں کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ یوں ایک دوجہتی راہی جال ہمارے سامنے آیا جس میں سمندری اور خلائی راہی جہات کی تکمیل ہونا باقی ہے۔ محققین کے بقول:

Flights to Rome" is a data visualization art project showing the entire global mobility network of flight and road infrastructure in a single image. It visualises for the very first time literally traveling from everywhere to everywhere on this planet.

ماہرین آثاریات کا ویژن سردست اصولِ تحرّک اخذ کرنے سے عاری ہے اور وہ انسانی تحرک کو قبل از تاریخ انسانی نقل مکانی سے لے کر موجودہ دور کی تلاش روزگار میں کی گئی نقل مکانیوں تک بہت سے تناظرات میں دیکھتے تو ہیں لیکن "سفر" کی مجرّد آثاریاتی تاریخی تحقیق کہیں بھی ان کے پیش نظر نہیں۔ وہ سفر، منزل اور نقطات آغاز و اختتام کے درمیان بنیادی تعلقات، ان تعلقات کی نقشہ کشی اور تجزیہ کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ آرکیوہسٹری میں مسافت کے مطالعہ کو ایک اپلائیڈ علم کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔ اور یوں راستوں اور منازل کی قدامت پر ان کا علم کسی اصول کا تابع نہ ہوسکنے کے نتیجے میں دور حاضر میں ان معلومات کو جدید جیوپولیٹیکل پالیسی سازی اور انطباق میں کوئی کردار ادا نہیں کرنے دیتا۔ ایسا نہیں ہے کہ آثاریات یا آثاریاتی تاریخی مطالعہ عہد حاضر میں فائدہ مند کردار ادا نہیں کر سکتا۔ ۱۹۹۴ء میں نیٹو نے موسمیاتی تبدیلیوں کی آثاریاتی تاریخ کے حوالے سے ماہرین آثاریات کی کانفرنس Third Millennium BC Climate Change and Old World Collapse ترکی میں بلوائی اور ناکام ریاستوں اور سماجی انہدام کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اگر اس مقصد کے لئے ماہرین آثاریات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے تو پھر موجودہ دور میں سیاحتی اور تجارتی مقاصد کے لئے چھوٹی سڑکوں سے لے کر عالمی شاہراہوں کے لئے راستوں کی نشاندہی اور تعمیر میں ان کے علم سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا جاسکتا۔ بسا اوقات کہا جاتا ہے کہ آثاریاتی تاریخی علم کے بغیر ہی جدید راستوں کی نشاندہی، تعمیر اور جدید بستیاں بسانے کا کام کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات درست نہیں کسی شوریدہ زمین سے جو قدیم راستہ گزرتا ہے اس میں میٹھے پانی کے مدفون کنویں کہاں کہاں ہیں۔ اور درہ خیبر کے میٹھے پانی کے چشمے کس دور میں بند کئے گئے یہ معلومات ماہرین آثاریات و تاریخ کے پاس ہیں۔ کس علاقے میں قدیم زمانے میں قیمتی دھاتیں اور پتھر کہاں کہاں سے نکلتے تھے یہ معلومات بھی آثاریات و تاریخ ہی مہیا کرتے ہے۔ کس مقام پر کیا واقعہ رونما ہوا اور اس کے کیا آثار ملتے ہیں؟ محکمہ سیاحت کو یہ معلومات بھی ماہر آثاریات و تاریخ نے ہی فراہم کرنی ہیں۔ کسی خطے میں کب اچانک موسمیاتی تبدیلی رونما ہو کر اسے صحرا میں بدل سکتی ہے؟ یہ ماحولیاتی آرکیالوجی کی معلومات بھی ماہرینِ آثاریات سے ہی ملیں گی۔ دریاؤں کے کناروں پر قدیم آبادیاں اور ان کو ملاتے قدیم راستے بھی ماہر آثاریات ہی آپ کو تلاش کر کے دے گا اور قدیم کھانوں اور صنعتوں کو دوبارہ کس طرح سیاحوں کو فروخت کے لئے پیش کرنا ہے یہ معلومات فراہم کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر منزل دوسری سے ملی ہوئی ہے اور موبلٹی نیٹ پر اپنا ایک نشان رکھتی ہے۔ علم جغرافیہ میں یہ ایک بنیادی تصور ہے لیکن اسے آثاریاتی تاریخ مطالعہ میں ایک اصول کے طور پر پیش کرنا اور اس اصول کی بنیاد پر ایسا اینالیٹیکل میپنگ ٹول پیش کرنا جو ان معلومات کو ویزیولائز کرے اور ماضی، حال اور مستقبل تینوں کے حوالے سے مفید ہو ایک اہم کام ہے جو ابھی کرنا باقی ہے۔

۲۰۱۵ء کے لگ بھگ میں نے ایک ملتے جلتے تصور پر فکری اور تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ یہ تصور بنیادی طور پر یہ تھا کہ:

کرہ ارض کی جملہ سفری جہات مل کر ایک راہی جال تشکیل دیتی ہیں جو دنیا کے ہر دروازے کو ہر دروازے سے جوڑتا ہے اور ہر آثاریاتی افق میں یہ لینڈ سکیپ موجود ہے۔ اب یہ جال فضائی اور خلائی جہات تک ممتد ہوچکا ہے اور خلائی آثاریات کی بنیاد رکھی جاچکی ہے۔ راستوں کو اس حقیقت سے ہٹ کر تجریدی شکل میں دیکھنا غلط ہے اور آثاریاتی افقوں / منظر ناموں اور موجودہ افق / منظر نامے کی نقشہ سازی راہی آثاریات کو مکانی آثاریات سے جدا کرتی ہے۔

اگرچہ Philipp Schmitt اور Benedikt Groß کا کام "all roads lead to Rome" کے محاورے کی حقیقت معلوم کرنے تک محدود ہے (۲۰۱۶ء ص ۳۷) لیکن نتائج کے لحاظ سے ان کا کام میرے نظریے کی قریب ترین تصویری تکمیل ہے جو میں نے ۲۰۱۵ء میں سوچا اور ۲۰۲۰ء میں پیش کیا تھا۔ روم کے راستوں کی اجتماعی تصویر ابھارنے کی یہ کاوش mobility patterns کو عالمی جامعیت میں دکھانے کی کاوش ہے جس کے لئے جدید گلیوں اور راستوں کی موجود معلومات کو routing algorithms استعمال کرتے ہوئے شہر سے براعظموں تک کے نقشوں کو ایک سکیل پر لاتے ہوئے تصویری شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یوں علاقائی، سیاسی اور جغرافیائی حالات کو راہی طریق پر سمجھنے کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ بقول مصنفین:

> During the process of finding the right methods and approaches the authors encountered several inspiring further threads of ideas. The authors created maps using algorithms for routing from multiple starts to a single destination and also multiple destinations. The researchers also used the developed methodology on a small scale to visualize mobility network diagrams of selected cities. The resulting images are not only visually intriguing, but also allow conclusions about how road infrastructure reflects regional, political and geographical situations.

تینوں محققین نے اس تحقیقی اور فنی پراجیکٹ کو All Roads to Rome: Visualizing Mobility at Scale کے نام سے ایک مضمون کی شکل میں پیش کیا۔ یہ مضمون Urban Mobility اور Fingerprint اور Street DNA جیسی اصطلاحات کو جو کسی ایک منزل تک پہنچنے والے متعدد رستوں کے لئے ایک الاگرتھم بنانے کے مراحل میں سامنے آئی تھیں دنیا کے سامنے پیش کرنے کا باعث بنا (۲۰۱۶ء ص ۳۷)۔ اس پراجیکٹ کے محققین کے بقول:

> It can be seen as a door opener for discussions about the connection between mobility and infrastructure, politics, history and geography (2016:40).
>
> Emphasizing the historic aspect of the project it would also be interesting how historical street graphs would change the images shown. Thus enhancing the images with various datasets can for example be interesting for history, sociology or particularly the emerging field of Digital Humanities. Projects from this field also tend to touch upon spatial mobility questions (2016:40).

حوالہ جات

All Roads to Rome: Visualizing Mobility at Scale-Proceedings of the IEEE VIS 2016 Arts Program, VISAP'16: Metamorphoses, Baltimore, Maryland, October 23th-28th, 2016.

https://benedikt-gross.de/projects/flights-to-rome

****

نقش الملك النجاشي الشهير أصحمة

زكريامحمد

The Arabic inscription of king Ashama in Negash- Ethiopia: an inscriber who doesn't know Arabic

Zakaria Mohammed

ARTICLE INFO

Keywords:
Arabic Script
Negash
Ashama
Inscription

ABSTRACT

This paper is devoted to a re-reading of the inscription of the famous King Negus Ashama of the Islamic tradition. The inscription is found in what is said to be the tomb of this king in the village of "Njash" in the Ethiopian province of Tigray. The inscriptiuon was published with a reading by Wolbert G. C. Smidt and Haggag Rashidy (2012), and two photographs of it were published. However their suggested reading was preliminary and there are many problems in adopting it. The inscription identifies the date of the Negus' death in the ninth year of the Hijrah, and describes the village of Negash as Sahira Al-Haq Negash. It is an expression that may indicate that its writer is not a Muslim, even if it was written for Muslim people. It seems that the village of Negash was a large city in the beginning of Islam, and that it was the centre of the country of Negus, who seems to have taken his name from its name.

كليدى الفاظ:
عربی رسم الخط
خط العربی
نیگاش
نجاش
اصمحہ
کتبہ
نقش

هذه الورقة مخصصة لإعادة قراءة نقش الملك النجاشي أصحمة الشهير في التقليد الإسلامي. النقش موجود في ما يقال أنه ضريح هذا الملك في قرية (نجاش) بإقليم تيغراي الأثيوبي. نشر النقش مع قراءة له كل من وولبر سميت وحجاج راشدي ، ونشر له صورتين. لكن قراءتهما كانت قراءة أولية وفيها مشاكل كثيرة جدا. النقش يحدد تاريخ وفاة النجاشي بالسنة التاسعة للهجرة، ويصف قرية (نجاش) بأنها (ساهرة الحق نجاش). وهو تعبير قد يشير إلى أن كاتبه غير مسلم، حتى لو كان كتبه لأناس مسلمين. ويبدو أن قرية نجاش كانت مدينة كبيرة في بدايات الإسلام، وأنها كانت مركزا لملك الملك النجاشي، الذي يبدو أنه أخذ اسمه من اسمها.

یہ مقالہ اسلامی روایت میں مذکور نجاشی نامی مشہوربادشاہ حضرت اصمحہؓ نجاشی کی لوح مزار کی تحریر پر نظر ثانی کے لیے وقف ہے۔ یہ کتبہ کہا جاتا ہے کہ ایتھوپیا کے صوبے ٹگرے کے گاؤں نیگاش میں ان بادشاہ کی قبر پر موجود ہے۔ یہ کتبہ پہلی بارعبارت کے ترجمہ کے ساتھ ولبر سمڈٹ اور حجاج راشدی نے شائع کیا تھا اور اس کی دو تصاویر شائع کی گئی تھیں۔ لیکن ان کا ان تصاویر کو پڑھنا ایک ابتدائی کوشش تھی جس میں کئی ایک مسائل موجود ہیں۔ یہ تحریر نویں سال ہجری میں نجاشیؓ کی وفات کی تاریخ کی نشاندہی کرتی ہے، اور نیگاش کے گاؤں کو ساحرہ الحق نیگش کے طور پر بیان کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا اظہار ہے جو اس بات کی طرف ممکنہ اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس تحریر کو چاہے مسلمانوں کے لئے ہی لکھا ہو تب بھی اس کا مصنف مسلمان نہیں معلوم ہوتا، ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں نیگاش کا قریہ ایک بڑا شہر اور نجاشی بادشاہ کا مرکز تھا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گاؤں نے نام اخذ کیا ہے۔

في العام 2011نشر نقش الملك النجاشي (أصحمه) الشهير جدا في التقليد الإسلامي، والموجود في قرية نجاش في إقليم تيغراي الأثيوبي، التي تبعد عن مدينةُ ورقو Wuqroالتي تقع على بعد 30كيلومترا شمالي ميكيلي. ويقول التقليد الإسلامي إن عشرات من المسلمين هربوا من اضطهاد وثنيي مكة في بدايات الإسلام ولجأوا إلى أرض هذا الملك الذي لا يظلم عنده أحد حسب وصف هذا التقليد. في القرية نجاش ضريح

يقال أنه ضريح للملك أصحمه ولاثني عشرة من صحابة الرسول المهاجرين من مكة. وبسبب ذلك كان هذا الضريح مكانا لاحتفال سنوي مهم ظل حيا حتى القرن التاسع عشر. ويعود Wollber G.C. SMIDT and M. Haggag RASHIDY الفضل لكل من وولبر سميت وحجاج راشدي في تعريفنا بالنقش، وفي نشر صورتين له في ورقة لهما بعنوان: (نقش عربي آخر في طريق التجارة الشرقي الثالث في تيغراي: ملك الحبشة في نجاش)*. والغريب أن نشر النقش لم يثر الاهتمام الكافي. وربما يعود ذلك إلى أن قراءة الناشرين للنقش تعاني من مشاكل تجعلها غامضة إلى حد بعيد. نقش الملك النجاشي أصحمهويجب القول أن المعلومات التي قدمها لنا الناشران عن النقش ضئيلة، وأنها جاءت نقلا عن ألسنة بعض السكان المحليين في المنطقة. تقول هذا المعلومات: "أن حجر النقش محفوظ في الضريح الذي يخص الصحابة ال 12للنبي محمد وأنه موجود في ساحة إمام مسجد (مسجد الإمام) (سميت و راشدي، صفحة .)124وقد لاحظ الناشران أن النقش مكتوب بشكل سيء إذا قورن بـ (نقش ورقو) الذي يعتقد أنه من القرن العاشر الميلادي. نقش ورقو ومقارنة بنقوش من خارج أثيوبيا، فإن النقش يعود إلى فترة بين القرنين 13-12ميلادية، حسب الناشرين. ومن وجهة نظري، فإن هناك بعض الإشارات في النقش قد تدفع بتاريخه إلى الوراء فترة لا بأس بها. على كل حال، فأدناه في الصورة قراءة الناشرين للنقش.وكما نلحظ، فإن هذه القراءة توحي بوجود مشاكل جدية فيها. فكيف يمكن أن تأتي كلمة (سيد) بعد كلمة (ملك) مثلا؟ كذلك، فإن الجملة (توفي من هجرية سنة)9تبدو غير سليمة. وعلى كل حال، فقد قدم الناشران قراءتهما على أنها قراءة أولية. وهو ما يعني أنهما كانا يدركان إمكانية تعديلها. ولنبدأ بقراءة النقش سطرا سطرا. السطر الأول قرأ الناشران الكلمات الثلاث الأولى بشكل سليم "هنا قبر ملك...". لكنهما فهما كلمة (هنا) على أنها تعني (هذا) thisبينما هي تشير في الحقيقة إلى المكان وليس إلى القبر. بذا فالاحتمال الفضل أن نقرأ كلمة (قبر) بصيغة المبني للمجهول (قُبِر). وسياق النص يدعم هذا كما سنرى. أما الكلمة الأخيرة في السطر فقد قرأها الناشران هكذا (الحبشة). وهذه قراءة خاطئة بكل تأكيد. فما لدينا هو الأحرف التالية: "النج...". ويبدو أن هناك حرف ألف ضاع مع الكسر في طرف السطر. أي أن الحروف تقرأ هكذا: "النجا". وهذا كلمة ستكتمل في السطر الثاني. السطر الثاني قرأ الناشران الحروف الأولى في هذا السطر على أنها (سيد). ولكن الحقيقية أن ما لدينا هو الحروف: "شيين". وهي حروف تكمل الكلمة التي بدأت في السطر السابق. بذا فمجموعة الحروف في السطرين تقرأ هكذا: "النجاشيين". عليه، فالملك يوصف بأنه (ملك النجاشيين). إنه ملك لمجتمع يدعى (النجاشيين). وهذا اللقب لم يرد في المصادر الإسلامية، التي كانت تدعو الملك وحده بالنجاشي. ومن الواضح أن الاسم على علاقة باسم القرية (نجاش). لكننا لا ندري إن كانت القرية قد أخذت اسمها من جماعة تدعى (النجاشيين) أو أن المجموعة هي التي أخذت اسمها من اسم القرية. ومن الواضع أن الاسم بهذه الصيغة يفتح ملف أصحمة النجاشي من جديد. الكلمة التي تلي هي اسم الملك (أصحما)، الذي ورد في الرواية الإسلامية بصيغة (أصحمه). أما الكلمة التي تلي الاسم فقد قرئت هكذا (توفي). لكن الحقيقة أن الموجود في نهاية السطر هو حرفان يقرءان هكذا: "بز." وهما جزء من كلمة تكتمل في السطر التالي. السطر الثالث قرأ الناشران الكلمتين الأولى والثاني هكذا: "من هجرية"، وهذه قراءة غير سليمة. فـ (من) جزء من كلمة (بزمن) المقسومة بين السطرين الثاني والثالث. بعد ذلك، يأتي الرقم (،)9وهو يقرأ بعد كلمة (بزمن،) رغم أنه وضع فوق الكلمة التالية (هجرية) التي قرأها الناشران بشكل صحيح. بناء عليه، فالنص يقول حتى الآن: نجا "هنا قُبِر ملك الشيين أصحما بز من 9هجرية" بالتالي، فالنقش يؤرخ دفن الملك النجاشي بالسنة التاسعة للهجرة. وهو بذلك يحدد لنا تاريخ وفاته. ومعروف أن النجاشي توفي في حياة الرسول، وأن الرسول صلى عليه صلاة الغائب. السطر الربع هذا السطر هو الأهم ربما، لأنه يعطينا في ما يبدو لمحة ما عن معتقدات النجاشينن. وقد قرأ الناشران السطر هكذا: "في شهر". أما قراءة الكلمة الأولى (في) فسليمة. لكن قراءة

الكلمة الثانية خاطئة. فهناك تاء مربوطة واضحة في أخر الكلمة. بالتالي لا يمكنها أن تقرأ (شهر). بل إنه من الصعب حتى أن تكون بالشين. لذا نقترح أنها: "سهرة". وهناك بعدها كلمة ثالثة لم يبصرها الناشران. وهي في الحقيقة واضحة، وتقرأ هكذا: "الحق". بناء عليه، فلدينا الجملة التالية: "في سهرة الحق". والكلمة الوسطى في الجملة غامضة كما نرى. السطر الخامس وفيه كلمة واحدة قرأها الناشران هكذا: "الشهداء" وهي قراءة خاطئة. فالكلمة تقرأ هكذا: "نجاش". أي أنها تذكر اسم القرية التي يوجد النقش فيها. بناء عليه، يمكن الافتراض أن (نجاش) كانت في السابق مدينة مهمة، وأنها كانت في ما يبدو مركزا لمملكة ولمجتمع أخذ اسمه من اسمها في ما يبدو: النجاشيين. إذن، فالسطران الأخيران يقولان: "في سهرة الحق نجاش". ونحن لا نعرف بالضبط معنى كلمة (سهرة) هنا. لكن يبدو أن الجملة تحمل وصفا دينيا للمدينة. ومن المحتمل أن كلمة (سهرة) على علاقة بكلمة (الساهرة) في سورة النازعات في القرآن: "فإذا هم بالساهرة" (النازعات .)14وهي كلمة غامضة هنا أيضا، ومختلف على معناها. وإذا صح أننا مع نفس الكلمة فإن الكلمة في النقش تكون مكتوبة من دون الألف. أي أن علينا أن نقرأها هكذا: (الساهرة)، وهي كلمة ذات طابع ديني كما هو واضح. وتبعا لبيت من شعر أمية بن أبي الصلت يبدو أن الكلمة تطلق على مقر ملك ذي طابع ديني: َم لـ ٌّك بساهـرةٍ إذا تُ ْلقَى نَمارقُهَ وكوبُه أما في القواميس فيقال إن الساهرة: "أرض لم توطأ، أو هي أرض يجدا الله يوم القيامة. وقال ابن السيد في الفرق: وقيل: هي أرض لم يعص الله عليها. وقيل: الساهرة: جبل بالقدس. قاله وهب بن منبه. وفي عبارة ابن السيد: أرض بيت المقدس. وقيل: الساهرة: جهنم" (الزبيدي، تاج العروس.) أما ربط الساهرة بالقدي، فما زال هناك باب في القدس يدعى: (باب الساهرة). وإذا استثنينا حكاية جهنم، فكل شيء يوحي بأن الساهرة أرض دينية. وهو ما يوحي به نص النقش. بذا فنجاش توصف أنها (ساهرة الحق.) وهو لقب ديني، وإن كنا لا نعرف معناه بدقة. بناء عليه، فالنقش كله يقول:"هنا قُ ب ر ملك النجا شيين أصحما بز من 9هجرية في سهرة الحق نجاش" وبناء على هذه القراءة فإن النقش يريد أن يخبرنا أن أصحما، ملك النجاشيين، قد قُـبِـَ ر في مدينة نجاش، التي توصف بأنها (ساهرة الحق)، أي مدينة الحق ربما، في السنة التاسعة للهجرة. بذا يجب قراءة الكلمة الثانية في السطر الأول على أنها (قُبِـَ ر)، بصيغة المبني للمجهول. نستخلص من هذا أن النقش غير إسلامي الطابع في غالب الأمر، حتى وإن كان كتب لجمهور عربي أو مسلم يعرف شيئا من العربية، يقدس هذا المكان ويحج إليه. يدل على هذا جملة (ساهرة الحق) لوصف نجاش. فهذه جملة لا تتوافق مع المعتقد الإسلامي. إنها جملة كتبها شخص يؤمن بالنجاشي وبمذهبه وبمدينته المقدسة. كما نستخلص أيضا أن النجاشي لم يكن ملكا لأثيوبيا، بل كان ملكا لمملكة في تيغراي الحالية. وأغلب الظن أنها لم تكن مملكة كبيرة. ويبدو أنها كانت مملكة مسيحية لها طابعها الخاص، وتمثل تيارا خاصا، ربما كانت له وشائج مع الإسلام في بواكيره.وعلى كل حال، فإن هذه استخلاصات أولية. وربما أدى إلى دراسة النقش بشكل أعماق إلى الحصول على استخلاصات أخرى.

****

The Arabic inscription of king Ashama in Negash- Ethiopia: an inscriber who doesn't know Arabic

Zakaria Mohammed

The Arabic inscription of King Ashama has been found in 2011 in the Tigrayan village of Negash in Ethiopia. Negash is a small village around 30 kilometers to the north of the city of Mekele. The Islamic tradition says that dozens of Prophet Muhammad's ﷺ companions have fled Mecca to find shelter in the land of this king who is supposed to be the king of Al-Habash (Abyssinians) at that time. Many Ethiopian Muslims and Christians believe that Negash was the shelter of those companions. In the village there is a shrine which is called as the tomb of king Ashama and of the twelve companions of Prophet Muhammad ﷺ. Around this shrine there was, until the end of the19th century at least, a huge yearly Islamic – Christian festival celebrating the memory of king Ashama and the Twelve companions. Thanks to Wollber G.C. Smidt and M. Haggag Rashidy that we have now two images of this unique inscription and a reading of its text which is to be found in their paper *Another Arabic inscription from the eastern Tigrayan trade route (III): the malik al-Habasha in Negash*. By comparing the style of the script of this inscription with other scripts mainly from out of Ethiopia, Smidt and Rashidy suggested that the inscription might be the product of the 12th – 13thcentury.

The inscription text is not always following strict horizontal lines. I suspect that the inscriber does not know Arabic. It looks as if he had been handed a text and asked to inscribe it on the stone slap. Additionally it seems that he copied the text as if it was written in vertical lines (columns). The proof is that the words and the letters in the right side are much bigger than those in the left side. He did not leave enough space for the last (column) to the left. This resulted in mixing the end of some lines with each other. Therefore the last words in line 3 should be read as part of line 2, and the last word in line 4 should be read as a part of line 3. Below is a table which compares my reading of the text with that of Smidt and Rashidy.

Line 1: Smidt and Rashidy read the last words in the first line as: الحبش (*al-Habash*). *Al-habash* is the name of Ethiopians in Arabic. It is almost impossible that the second word could be read as: *alhabash*. What we have in the end of the line is: النجا or الحبا. These letters are part of a word to be completed in the second line. **Line 2:** The first letters in this line are شيين *shien*. They are the completion of the last word. Then the whole word must be read as: ' النجاشيين *al-najashians*' word or ' الحبشيين *al- habayssien*' (the Abyssinians). I would prefer the first possibility. It speaks about the king of the Najashians,which means 'the follower of the Najashi'. If this reading is right it means that there was a people called 'Najashien' of a cult followers called by this name. Because Smidt and Rashidy seemed to have rushed to read the end of the first line as *alhabash* they were forced to read شيين *shien* as a full word ' سّيد *said*' (lord, mater). Of course there is no such word in the text. This supposed word is only the completion of the word which starts in the first line: Al-najashien. Smidt and Rashidy read the second word in this line as أصحمة with the tethered (t) in their Arabic copy of the text. The name of the king should be read with an (a) not with a tethered (t) *ashama*. They read the last word as توفى Tawaffa and it's a right reading, but we have to notice that the (a) is mostly blurred.

The continuation of **Line 2:** Smidt and Rashidy considered the word and the number: 9 ' سنة the year 9' as part of the **third line**. In fact they are an extension of the second line Line 3: This line contains two words: من هجر Smidt and Rashidy read the second word as هجرية . It is very difficult to agree with that. What they think is ية is indeed the word ' سنة year'. This line has also an extension which Smidt and Rashidy considered as part of the next line. This extension contains one word: الحق So line three reads: من هجر الحق The whole phrase between lines 2 and 3 reads: من هجر الحق9 توفي سنة which means: 'he passed

away in the ninth year of the migration' of the truth'. Using the word الحق to describe Prophet Muhammad ﷺ seems unique.

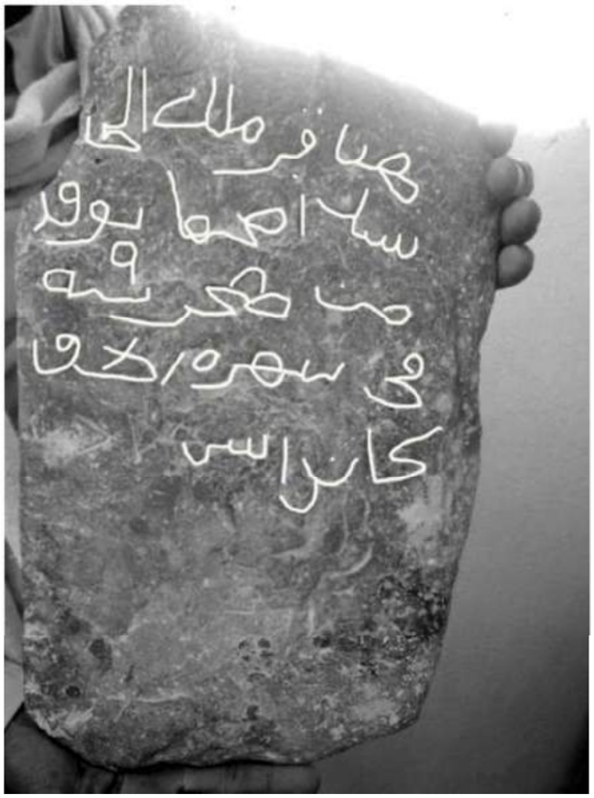

My tracing of the text letters with the electronic pen

Usually Muslims spare this word to God. The problem of the above phrase is that the word هجر must be with a tethered (t) هجرة . But the (ة) is not there. It seems that the inscriber forgot to write it. Somebody noticed that and asked the inscriber to insert the (ة) after the ر. He did that, but instead of inserting it after the ر of هجر he inserted it after the ر of the word شهر in the next line. This is really a rare and strange case. This case confirms the suggestion that the inscriber doesn't know Arabic.

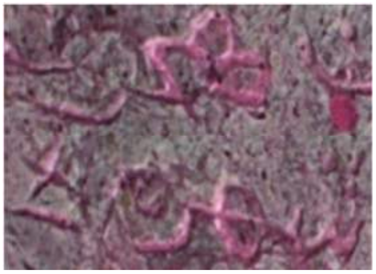

The tethered (t) in the wrong place **Line4:** This line contains two words: ' شهر في in the month'. Line 5: There are two words in this line. Smidt and Rashidy read the second of them as: 'الشهداء the martyers' while missed the first one. In my reading the two words are dating Ashama death to: كانن الثني January. The name of the month is written without the long vowel in both of its parts. The whole text reads:

هنا قبر ملك النجا- شيين أصحما توفي سنة 9 من
هجر الحق في شهر كانن الثاني [كانون الثاني]

This is the Grave of the king of the Al- najashien Ashama. He died in the ninth year of the migration of the Truth {Muhammad} In the month of January.

Lastly, according to this reading the text is the product of two traditions. The first is an

Islamic one which dated the death of Ashama with the ninth year of Alhijra, the migration of the prophet Muhammad to Yathrib. The second is related to a local Ethiopian Christian tradition which dated the passing of Ashama to the month of January.

****

عربی رسم الخط کا ارتقاء پہلی صدی ہجری میں

مظفر احمد

Development of Arabic Script During First Century After Hijra

ARTICLE INFO | **ABSTRACT**

Keywords:
Arabic Script
Jaf script

Thousends of early Islamic Arabic inscription hve been discovered in Africa, Middle East and Arabian Panensula in recent years. These inscriptions provided scholars with a unique opportunity of analyse the development of pre- Islamic North Arabic script throughout the first century AH. In this paper, these developmnts are observed which reformed the earlier Arabic script ino at least two official shapes, Jaf or Makki script and Khat Musahif wa makateeb or Madani script along with many verients which developed independently, followed one of these two veriaents or developeped a hybred script or an admixture of both Makki and Madani writing traditions.

کلیدی الفاظ:
عربی رسم الخط

خلاصہ: افریقہ۔ مشرق وسطی اور جزیرہ نمائے عرب سے گذشتہ چند برسوں میں ہزارہا کی تعداد میں ابتدائی اسلامی عہد کے کتبات بر آمد ہوئے ہیں۔ ان کتبات کی دریافت نے ماہرینِ قدیم عربی رسم الخط کے لئے ایک نادر موقع فراہم کیا ہے کہ وہ زمانہ قبل از اسلام کے شمالی عربی رسم الخط میں پہلی صدی ہجری کے دوران واقع ہونے والی ارتقائی تبدیلیوں کامشاہدہ کر سکیں۔ ذیل کے مضمون میں انہی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا گیا ہے جو زمانی قبل از اسلام کے رسم الخط میں پہلی صدی ہجری کے دوران واقع ہوئیں اور جنھوں نے ابتدائی عربی رسم الخط کو کم از کم دو سرکاری عربی رسوم الخطوط میں بیک وقت ڈھالا یعنی مکی خط جاف اور مدنی خط مصاحف و مکاتیب۔ ان دونوں بنیادی خطوط کے علاوہ بھی ایک تعداد ایسی تحریری طرزوں کی سامنے آئی جو آزادانہ طور پر یا ان دو میں سے کسی ایک اور یا پھر دونوں یعنی جاف اور خط مصاحف و مکاتیب کے مشترکہ خدوخال کی حامل تھیں۔

دنیا بھر کے وہ رسم الخط جو انسانی صوت یعنی آواز کی تصویر حرف کی شکل میں پیش کرتے ہیں صرف ایک بار ایجاد ہوئے۔ کافی حد تک یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی مؤجد کوئی اٹھارہ سو سے دو ہزار برس قبل مسیح میں مصر سے میسوپتامیہ کے درمیان پھیلی ہوئی وہ سامی النسل اقوام تھیں جو اپنی سوچ سے پیدا ہوئی روزمرہ بات چیت کی صوتیات کو کسی ٹھوس شے پر منتقل کرنے کے قابل تھیں۔ جب کانسے کے دور کے اختتام سے کچھ صدیاں قبل سامی قبائل و اقوام انسانی گفتار کی بنیادی اکائیوں کو ٹھوس میڈیم پر نقش کرنے کی کامیاب تجربہ کاری کررہے تھے تب اس وقت کی معلوم دنیا میں مصری اور میسوپتامی پیچیدہ تحریری نظام بالاتر تمدنی ورثہ مانے جاتے تھے۔ ان متمدن معاشروں میں سامی طرز تحریر کو ادنیٰ جان کر نظر انداز کردیا گیا تھا۔ لیکن کانسے کے زمانے کے اختتام پر مصری اور متفرق شامی اور میسوپتامی بادشاہتوں کی بالادستی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس سیاسی خلا کو شام میں سامی قبائلی ریاستوں نے پورا کیا۔ شام میں شامی ریاستوں کے قیام نے سامی صوتی نظامِ تحریر کے فروغ کی راہ ہموار کی اور کچھ ہی عرصے میں مشرق میں آرامیوں اور فونیقیوں جبکہ مغرب میں فونیقیوں اور یونانیوں نے سامی تحریری نظام کو ہر طرف پھیلا دیا۔ ہر جگہ ان سامی ”صوتی تصویر چوں“ کی جنہیں ہم حروف کہتے ہیں الگ الگ تجریدی اشکال سامنے آتی رہیں اور انہیں قدیم ترین ابجدی حروف کی اشکال کی طرف لوٹانا بتدریج مشکل ہوتا گیا۔ تاہم ماہرین رسم الخط حروف کے پھیلاؤ اور ایک قوم سے دوسری قوم تک ان کے سفر کو واپس کامیابی سے ان کے اصل کی طرف لوٹا سکتے ہیں۔

سامی رسم الخط کی بنیادی خصوصیات

سامی رسم الخط کی تین ابتدائی شاخیں فونیقی کنعانی، آرامی اور جنوبی عربی ہندوستان، بحیرۂ روم اور ایتھوپیا کے درمیان وسیع رقبہ پر اپنے اپنے طور پر ارتقاء پذیر رہی ہیں لیکن ان کا منبع بہرحال ایک ہے۔ یہ منبع دراصل وہ اصول ہے جس کے تحت انسانی ذہن میں پیدا ہونے والی سوچ کو گلے اور حلق کے صوتی اعضاء اور مخارج کی مدد سے نہ صرف ارتعاشی لہروں کی صورت میں دوسروں کے آلہ صوت یعنی کان تک آواز کی صورت میں

پہنچا کر "ذہن نشین" کرایا جاسکتا ہے بلکہ اس سوچ کو کسی میڈیم پر "لکھ" کر بصری آلہ یعنی آنکھ اور لمسی آلہ یعنی انگلیوں کی جلد کی مدد سے دوسرے اذہان تک منتقل کیا جاسکتا ہے۔ انسانی سوچ کو سوچ کی جملہ ڈائنامکس کے ساتھ ایک دماغ سے دوسرے دماغ تک بعینہ منتقل کرنا سامی قبائل کے اس اصول کی دریافت سے پہلے ممکن نہیں تھا۔ اس اصول کی دریافت کے نتیجے میں سامیوں نے انسانی مخارج صوت سے ادا ہونے والی جملہ آوازوں کی شناخت کی اور ہر صوت کو اس صوت کی ابتدائی آواز کے لحاظ سے ایک نام دیا۔ یوں اصوات کو الف، بے، جیم اور دال وغیرہ کا نام دیا گیا اور پھر ہر نام کو اس نام کی صوت سے شروع ہونے والی ایک جاندار یا شے سے منسوب کرکے اس شے کا نام دے دیا گیا جیسے الف بمعنی الیف (پالتو) اور ب بمعنی بیت یعنی گھر۔ سامی اصولِ صوتی تحریر کی موجودگی میں اصوات کو تحریر کرنے کے لئے صوتی اشکال میں تجریدی تغیر کوئی معنی نہیں رکھتا اور ہر صوتی علامت کی مختصر و مجرّد شکل وجود میں آسکتی ہے۔ اس بات کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ عربی تحریر دراصل سامی ابجدی رسم الخطوط کے ارتقاء کی حتمی شکل ہے جو ایک رواں اور باہم پیوست شارٹ ہینڈ یعنی تیزی سے بنائے جانے والے تجریدی صوتی خاکے ہیں جو سوچ کو معجزاتی برق رفتاری سے لکھتے چلے جاتے ہیں۔

عربی رسم الخط اور انسانی ذہن میں رشتہ

عربی رسم الخط دراصل سامی خط کے تینوں بڑے گروہوں کی نمائندگی میں ایک حتمی ارتقائی کڑی ہے جس کی تخلیق میں ان رسم الخطوط کا ایک تاریخی تسلسل کارفرما ہے جو سطری اتصالِ حروف کی طرف پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ مائل ہوئے یعنی سریانی عام و سریانی مانوی، نبطی، مسند اور پہلوی۔ عربی طرز تحریر میں ایک فکری جہت نئی ہے اور وہ یہ کہ ہر صوتی تصویرچے (حرف) کے لئے ایک الگ شکل کی ضرورت نہیں بلکہ ایک سے زائد اصوات کی نمائندگی ایک ہی صوتی تصویرچہ (حرف) کرسکتا ہے اور انسانی آنکھ انسانی ذہن کے گفتاری تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک ہی شکل کی ایک سے زائد اصوات کی الگ الگ شناخت کرسکتی ہے۔ ان دو اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عربی اتصالی حروف کا یہ مختصر ساسیٹ کسی ایک گذشتہ سامی ابجدی نظام کی ارتقائی شکل نہیں بلکہ یہ ابتدائی ترین سامی حروف کی فکری و تکوینی سطح پر ایک مکمل اور نئی بازیافت ہے۔ دراصل عربی حروف اور زبان ہر دو سامی گروہ کی ہر رکن زبان اور رسم الخط سے عملِ ارتقاء میں عملی متحرک مشارکت کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں نہ کہ باقی جامد سامی رسوم الخط کی طرح صرف کسی مخصوص تاریخی رشتۂ تسلسل میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عربی رسم الخط کے ارتقاء کا عمل قیدِ زمان و مکان میں جاری تو رہا ہے لیکن اس میں ایک فکری الہامیت بھی کارفرما رہی ہے جو عربی زبان کے ریاضیاتی اطلاقی پہلو کی مدد و معاون ہے۔

عربی روم الخط صرف نبطی سے نہیں بلکہ نبطی، سریانی، متاخر عبرانی اور پہلوی رسوم الخط کی بنیاد میں موجود پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ پائے جانے والے ایک مادر رسم الخط سے مشتق ہے۔

عربی کو ماہرین رسم الخط نے اپنے اصل کی طرف لوٹانے کے لئے کئی تحقیقی آراء پیش کی ہیں۔ عربی رسم الخط کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں اب تک کی آثاریاتی تحقیق کوئی حتمی جواب پیش کرنے سے عاجز ہے۔ پہلی صدی کے آس پاس کے سامی رسوم الخط کا تقابلی جائزہ قدیم عربی تحریر کو آرامی اور عبرانی رسم الخطوط کی ان سادہ طرزوں سے ہی نکلا ہوا دکھاتا ہے جنہوں نے پہلی صدی عیسوی کے آس پاس سریانی اور نبطی کو جنم دیا لیکن اکثر محققین اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں زمانہ اسلام سے قبل کا وہ عربی رسم الخط جسے خطِ جزم کا نام دیا گیا ہے براہِ راست نبطی خط سے اخذ کردہ ہے جیسا کہ لیلیٰ نحمے نے نبطی کتبات کے مطالعہ سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے (Laïla Nehmé 2017)۔ زیادہ درست بات یہ ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے درمیان باہم ملتے جلتے اور ایک مادر خط سے نکلے ہوئے نبطی، سریانی، مانوی سریانی اور پہلوی خطوط میں سے ہر ایک خط کے علاقے میں عربی بولنے والے قبائل نے ایک سادہ بدوی شارٹ ہینڈ کو اسی علاقے کے رائج انداز میں تحریر کیا۔ یہ عربی شارٹ ہینڈ رسم الخط دراصل سامی رسوم الخطوط کا ایک حتمی ارتقائی مرحلہ تھا۔ اس میں ہر صوت کو الگ الگ حرفی صورت (glyph) نہیں دی گئی بلکہ عربی کی ۲۸ اصوات میں گروہ

بندی کر کے ہر گروہ کو ایک ہی حرفی صورت فراہم کی گئی۔ بعض صورتوں میں تو ایک سے زیادہ گروہوں کی درمیانی حرفی صورت کو بھی ایک ہی شکل فراہم کی گئی۔ مثلاً ح، خ اور ج کے لئے ایک ہی حرفی شکل مختص کی گئی اور ب، ت، ث، ن اور ی کی درمیانی صورت بھی یکساں رکھی گئی۔ یوں تحریر کو سمجھنے کی ذمہ داری حروف ابجد سے اٹھا کر انسانی دماغ کو سونپ دی گئی۔ اہم بات یہ ہے کہ ابجد کے قدیم ترین صوتی تصویرچوں سے ابتدائی عربی حروفی اشکال کا موازنہ کیا جائے تو عربی حروفی اشکال زیادہ تر انہی کی سادہ ترین اور مختصر صورتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سامی ابجدی حروف نے ہزار ہا برس میں جو ارتقائی منازل طے کیں عربی خط اس کی براہ راست تو نہیں البتہ اس کی مختصر ترین، منطقی اور حتمی صورت ہے۔ چوتھی صدی عیسوی سے شام کے علاقوں میں عربی رسم الخط اپنی پختہ ابتدائی شکل میں رائج تھا جس کی شہادت ام جمال، النمارہ، حلب اور حرّان سے ملنے والے چند کتبات کی صورت میں دستیاب ہوئی۔ ان کتبات کا مطالعہ ایک صدی سے زائد عرصے سے جاری ہے اور اس بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ یہاں اس کی دہرائی کی ضرورت نہیں۔ اس تحقیقی مضمون کا دائرہ کار وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ ابتدائی عربی رسم الخط پہلی صدی ہجری میں داخل ہوتا ہے۔

آغاز اسلام کے وقت عربی رسم الخط کی حالت

ظہورِ اسلام کے بعد بھی ابتدائی اسلامی عربی رسم خط میں یہ علاقائی انداز برقرار رہے۔ سرِ دست ہمارے پاس سریانی اور نبطی انداز کی عربی تحریر کی آثاریاتی شہادت موجود ہے۔ یہ شہادت کتباتی صورت میں نقوش اُم الجمال اول و دوم (حران)، نقش النمارۃ (جبل دروز میں صحرائے نمارہ)، نقش زبد (قنسرین) و نقش حران پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ حران اور زبد کے درمیان واقع ہے جو بہر حال غالب نبطی اثر کا علاقہ نہیں بلکہ سریانی خط کا مرکز رہا ہے۔ تاریخی حیرۃ اور انبار سے عربی خط کے زمانہ جاہلیت میں مکہ اور طائف منتقلی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ تفصیل مشہور کتاب فہرست ابن ندیم میں مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں شام وار دن اور جزیرہ نمائے عرب میں مزید ایسی دریافتیں بھی ہوئی ہیں۔

مدنی دور میں عربی نویسی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ جنگ بدر میں پکڑے جانے والے مکی قیدیوں سے مدینہ منورہ میں بچوں کو عربی تحریر کا فن سکھلایا گیا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مدینہ منورہ میں جنگ بدر تک ایسے لوگ موجود نہیں تھے جو عربی رسم الخط اس حد تک جانتے کہ اسے آگے دوسروں کو سکھا سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدینہ منورہ میں عربی رسم الخط کی جو طرز متعارف ہوئی وہ خط حجازی مکی خط جزم (جاف) ہی تھی اور بنیادی طور پر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ایک ہی خط رائج تھا یہاں تک کہ کتابت مصحف کے لئے اس میں روانی، خوبصورتی اور توازن پیدا کرنے کی غرض سے ایک خط موزوں کیا گیا جو بعض مصاحف میں ہمیں نظر آتا ہے جبکہ ہر قسم کی سرکاری، مذہبی، علمی اور روزمرہ کی تحریر کے لئے جدید مکی خط میں ہی جسے زیادہ بہتر طور پر خط مکی المدنی کہا جا سکتا ہے بہتری لائی جاتی رہی یہاں تک کہ وہ خطِ کوفی اور خط نسخ کی ابتدائی صورتوں میں اپنی مکمل ارتقائی صورتوں تک پہنچ گیا۔

مکاتیب کا رسم الخط

اسلامی دور میں عربی نویسی کی ابتداء کی مادی ثقافتی شہادت ان مکاتیب (خطوط) کی ہے جو سن ہجری کی پہلی دہائی میں مختلف شہنشاہوں اور حکمرانوں کے نام لکھے گئے۔ ان مکاتیب کو جدید ماہرین کی اکثریت نے شہادت کے طور پر قبول نہیں کیا لیکن دستیاب مکاتیب کی اندرونی شہادت اور بعض مکاتیب کے بارے میں موجود تاریخی شہادتوں کی روشنی میں یہ ممکن نہیں کہ ان مکاتیب کو تحریری قدامت کے تجزیئے کی حدود سے باہر رکھا جائے۔ میں نے مکاتیب کی طرز تحریر کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور یہ محققانہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ مکاتیب ایک ہی طرز میں ایک سے زائد انداز میں تحریر کئے گئے ہیں اور یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

علی الغبان نے دور نبوی ﷺ کے کسی کتبے یا مکتوب کے اصل ہونے کو تسلیم نہیں کیا اور چمڑے پر تحریر مکاتیب کے C14 ٹیسٹوں کی ضرورت پر زور دیا ہے اور یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے جو بڑی حد تک معقول ہے کہ مکاتیب مبارکہ پر بعد میں آنے والے لوگ دوبارہ بھی قلم پھیرتے رہے۔ البتہ وہ منذر بن ساویٰ کے نام مکتوب کو پہلی صدی کے حجازی رسم الخط میں لکھا ہوا تسلیم کرتے ہیں۔ (الغبان ص ۹۳)۔ یہاں الغبان اور دوسرے

محققین جیسے کہ سارہ زبیر مرزا کی یہ علمی کمزوری سامنے آتی ہے کہ انہوں نے مکاتیب کی تحریرات کا درست تقابلی جائزہ نہیں لیا۔ میرے جائزے کے مطابق اگرچہ یہ امکان موجود ہے کہ بعد کے زمانوں میں کچھ عبارتوں پر جزوی طور پر دوبارہ قلم پھیرا گیا ہو لیکن اس عمل سے عبارت اس حد تک متاثر نہیں ہوئی کہ ان مکاتیب کا تقابلی جائزہ نہ لیا جاسکے دوسرے یہ کہ چمڑے کے سکڑنے یا پھٹنے کے شواہد موجود ہیں جس کے نتیجے میں تحریر بھی سکڑی ہے۔۔ میرے تفصیلی جائزہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دستیاب مکاتیب کم از کم دو کاتبوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ ایک کاتب کا ہاتھ حروف کو کم اونچائی میں طوالت کی طرف بڑھاتا ہے اور دوسرے کاتب کا ہاتھ حروف کو نسبتاً چوکور شکلوں میں مرتسم کرتا ہے۔ منذر بن ساویٰ اور مقوقس کے نام مکاتیب اس کاتب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں جو "من" کو بغیر دور والے نون اور میم کی مد سے "لا" کی طرح ایک لگیچر کے طور پر لکھتے تھے اور دوسرے کاتب "من" کو نسبتاً گول اختتام والے نون کے ساتھ ایک عام لفظ کی طرح لکھتے تھے۔ اسی طرح پہلے کاتب دال کو مڑے اختتام والی لمبی "دال" کے ساتھ جبکہ دوسرے کاتب چھوٹی اور نسبتاً مدور دال کے ساتھ لکھتے تھے۔ اس طرح کے اور بہت سے فرق بھی میں نے نوٹ کئے ہیں جو اہل مکہ کے ہاں رائج دو الگ طرزوں یعنی خط انباری اور خط حیری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قبل از اسلام عربی کتبات میں ان دو طرزوں کے علاوہ عبید اللہ الکاتب کے کتبے میں ایک سریانی طرز بھی نظر آتی ہے۔

یہ مکاتیب لازمی طور پر قبل از اسلام عربی رسم الخط کی پیروی کرتے ہیں جس میں مندرجہ بالا دونوں طرزوں کے موجود ہونے کی کتباتی شہادت موجود ہے۔ اور یہی دو طرزیں ہمیں جبل سلع کے مدنی کتبات اور عہد خلافت راشدہ میں پپائرس اور پتھر پر نظر آتی ہیں یہاں تک کہ بنی امیہ کی حکومت کے وسطی اور آخری دور میں یہی دو طرزیں ایک چوکور جیومیٹریکل طرز اور ایک نسبتاً مدور طرز میں سرکاری سرپرستی میں مروج نظر آتی ہیں۔

جبل سلع کے کتبات

سن ہجری کے آغاز کے سالوں میں ہی سلع کے کتبات میں ایک نئے عربی خط کا تجربہ کیا گیا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ ان کتبات کو ڈاکٹر حمید اللہ نے ۱۹۳۹ء میں ریکارڈ کیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جبل سلع کے کتبات دراصل سرکاری سطح پر ایک عربی تحریری طرز کی بنیاد رکھنے کے لئے کندہ کئے گئے تھے اور جب موقع آیا تو مصاحف کی تیاری میں انہی نمونوں کو سامنے رکھا گیا۔ جبل سلع کے کتبات میں نکتوں کا استعمال بھی دیکھنے میں آیا ہے۔

پہلی صدی ہجری کے تین بڑے عربی خط

پہلی صدی عیسوی میں تین بڑے انداز اسلامی سلطنت کے طول و عرض میں پھیلے:۔

خط حجازی مکی جاف

ان میں سے ایک انداز وہ ہے جسے خطِ جزم یا جاف یعنی خشک حجازی انداز کہا جاتا ہے اور جسے بنو امیہ نے جاری رکھا۔ اس کی ایک لمبوتری اور کونہ دار شکل میں قدیم ترین مصاحف لکھے گئے ہیں۔ یہ خط عام طور پر اموی کتبات کندہ کرنے میں استعمال ہوا ہے۔ مصر میں پپائیرس میں بھی اس خط کے نمونے ملے ہیں۔ مکی جاف خط میں نکتوں کا استعمال بنو امیہ کے دور کے بالکل آغاز سے ہی کر دیا گیا تھا اور اس کی مثال لازماً مانوی سریانی سے ہی لی گئی تھی جس میں پہلی بار نکتے متعارف کروائے گئے تھے۔

خط حجازی مکی المدنی

دوسرا انداز وہ ہے جسے مدینہ کی مکی و مدنی آبادی نے خط جزم جاف مکی کو قدرے نرم اور مدور کر کے موزوں کیا اور جس میں بہت سے کتبات لکھے گئے اور پہلی صدی ہجری میں تعلیق پیدا کر کے اس خط میں چند ایک مصاحف بھی تحریر کئے گئے۔ اس خط کی کئی ایک طرزیں ریکارڈ کی گئی ہیں۔ مصری پپائیرس اور اموی سنگ میل کتبات میں بھی یہ خط استعمال کیا گیا ہے۔

خط مصحف

یہ خط پہلے پہل جبل سلع میں موزوں کیا گیا جس کی مثالیں ڈاکٹر حمید اللہ نے ۱۹۳۹ء میں ریکارڈ کیں۔ جبل سلع کے کتبات کے بارے میں الغبان کی رائے یہ ہے کہ یہ خلافت راشدہ کے اولین زمانے کے ہیں۔ کتبات میں نکات بھی موجود ہیں۔ الغبان نے بظاہر خط مشق والے کتبے کو اولین خلافت راشدہ کے دور کا قرار دیا ہے اور زہیر کے کتبے میں بڑی یے کی شکل کو بھی خط

مشق کا اثر قرار دیا ہے اور زھیر کے دوسرے کتبے میں بھی مولی کی یے کو اسی ضمن میں لیا ہے۔ الغبان نے ان کتبات اور جبل سلع کے بظاہر خط مشق کے کتبے کا تعلق اس مصحف عثمان سے قائم کیا ہے جس کی ایک کاپی ازبکستان میں موجود ہے۔ (الغبان: ۲۰۱۰ص ۹۷)۔ الغبان دراصل صرف کتباتی اور تحریری شہادت کو دیکھ رہے ہیں اور اس اہم تاریخ تناظر کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ بعض کاتبوں کو پہلی اسلامی ریاست کی طرف سے سریانی سکھائی گئی تھی اور ریاستی کتابتِ مصحف کے لئے معیار اور طرز کی فراہمی بھی ان کی ہی ذمہ داری تھی۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو جبل سلع کے کتبات دراصل خطِ مصحف کی نقول کی تیاری کے لئے کلید کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں زیادہ امکان یہی ہے کہ کسی سریانی جاننے والے کاتب نے (خط حجازی کی رائج طرزوں کے بر خلاف جو چرمی سطح پر خوبصورت جمالیاتی تاثر دینے میں ناکام تھیں) عربی حروف کو مسیحی صحائف کی سریانی کتابت کی طرز پر متعارف کرایا۔ عباسی دور کے آغاز تک مصاحف خط حجازی میں بھی لکھے جاتے رہے اور خط مصحف میں بھی۔ ہر دو کی کافی آثاریاتی شہادت موجود ہے۔

نکات کا معاملہ

علی الغبان نے پہلی صدی ہجری کے عربی کتبات کا مطالعہ عہد خلافت راشدہ تک کیا ہے۔ انہوں نے حیرہ اور انبار کے مشترکہ اثرات رکھنے والے رسم الخط کے حجاز میں رائج ہونے کے حوالے سے اسے حجازی خط کا نام دیا ہے اور اسے مکہ، مدینہ منورہ اور طائف کا مروجہ خط قرار دیا ہے (الغبان ص ۹۳)۔ ان کی رائے میں اسی دور میں ہی نکتوں کا نظام موجود تھا لیکن یہ کاتب کی صوابدید پر ہوا کرتا تھا کہ وہ اسے استعمال کرے یا نہ کرے (الغبان ص ۹۳)۔ لیلیٰ نحمے نے نبطی رسم الخط کے جو کتبات دریافت کئے ہیں ان میں نکات کا نظام موجود ہے (نحمے ۲۰۱۰)۔ لیکن یہ بات کوئی نباطی رسم الخط تک ہی خاص نہیں تھی۔ نکات کا زیادہ منظم نظام ہمیں مانوی سریانی رسم الخط میں ملتا ہے جو زنادقہ عرب کے ہاں رائج تھا۔ نکات کے اولین ہجری دہائی میں استعمال کی سند محققین اس روایت سے لاتے ہیں جو أدب الإملاء والاستملاء لابن السمعانی (حدیث ۱۶۸) میں بیان ہوئی ہے زیر بحث لا چکے ہیں کہ پہلے اموی خلیفہ نے اپنے کاتب سے کہا کہ:

يَا عُبَيْدُ ، ارْقُشْ كِتَابِكَ ، فَإِنِّي كَتَبْتُ بَيْنَ يَدَيِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابًا رَقَّشْتُهُ ، قَالَ : قُلْتُ : وَمَا رَقْشُهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ؟ قَالَ : أَعْطِ كُلَّ حَرْفٍ مَا تَنُوبِهِ مِنَ النُّقَطِ.

حقیقت بھی یہ ہے کہ امیر معاویہ کے دور میں ہی ہمیں سد طائف اور بعض دوسرے مقامات پر ان کے حکم سے لکھوائے گئے کتبات میں نکات نظر آتے ہیں۔ اسی طرح الفراء نے بھی اولین ہجری سالوں میں ایک بزرگ کاتب کے مصحف کی کتابت میں نکات استعمال کرنے کی گواہی دی ہے (الفراء: ۱۹۷۲ء ص ۱۷۲)۔

خلاصہ

مندرجہ بالا معلومات کا یکجائی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربی خط کی کم از کم دو طرزیں رائج تھیں جنہیں ابتدائی عرب مصنفین نے خط حیرہ اور خط انبار سے شناخت کیا ہے۔ یہ دونوں طرزیں ہمیں اب تک کے دریافت شدہ قبل از اسلام عربی کتبات میں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک خط سریانی علاقوں میں پنپنے کی وجہ سے سریانی کتابت کا رنگ لئے ہوئے تھا اور دوسرا نبطی علاقوں میں پروان چڑھنے کی وجہ سے نبطی اثرات کا حامل تھا۔ مکہ میں ان دونوں خطوط کے مشترکہ خدوخال کی بنیاد پر ایک جدید خط موزوں ہوا جسے خط مکی یا خط حجازی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ اسی خط مکی کے کاتبانہ انداز ہی ہیں مختلف انداز تھے جو مکاتیب مبارکہ میں نظر آتے ہیں۔ یہی خط مدینہ میں جنگ بدر کے بعد متعارف ہوا تو اس میں قدرے موزونیت پیدا ہوئی اور یوں ابتدائی مکی المدنی خط وجود میں آیا۔ تیسرا خط خطِ مصحف تھا جو سریانی کتابت کے اصول پر جبل سلع کے کتبات (حمید اللہ ۱۹۳۹) میں متعارف کرایا گیا۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جبل سلع پر کندہ مصحفی خط کی طرز بنو امیہ کے لئے دلچسپی کا باعث نہ تھی۔ اموی دور میں خطِ حجازی جاف مکی کی بہتری کے لئے تجربات کئے گئے جس کے نتیجہ میں اولین کوفی خط وجود میں آیا لیکن عوام الناس کی حد تک خط حجازی کی مکی اور مکی المدنی (خط لین) طرزیں اپنی سادہ شکل میں ہی کافی عرصے تک رائج رہیں۔ امویوں نے اسے کپڑے، سکوں اور کتبات کے لئے خوب استعمال کیا۔ مصر میں پپائرس پر پہلے پہل خط حجازی مکی جاف نے فروغ پایا اور بعد میں خط مکی المدنی بھی پپائرس پر لکھا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایران اور اس کے ملحقہ بعض علاقوں میں آباد عرب

قبائل صدیوں بعد تک ابتدائی مکی جاف رسم الخط میں لکھتے رہے جس کی چند مثالیں موجود ہیں۔

	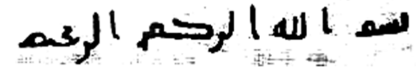	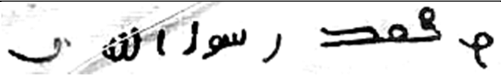
بنام مقوقس	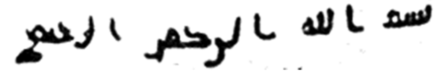	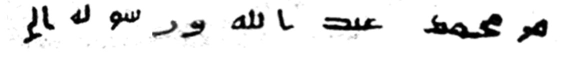
بنام نجاشی		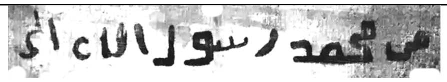
بنام ہرقل	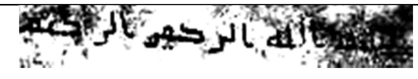	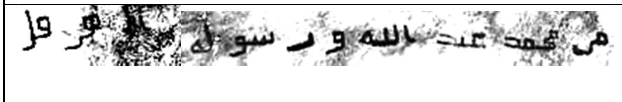
بنام ابنا الجلندی	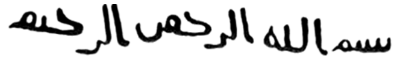	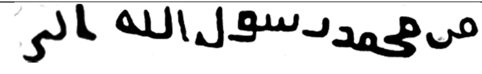

جدول ا۔ مکاتیب مبارکہ کی ابتدائی عبارت کا تقابلی جائزہ

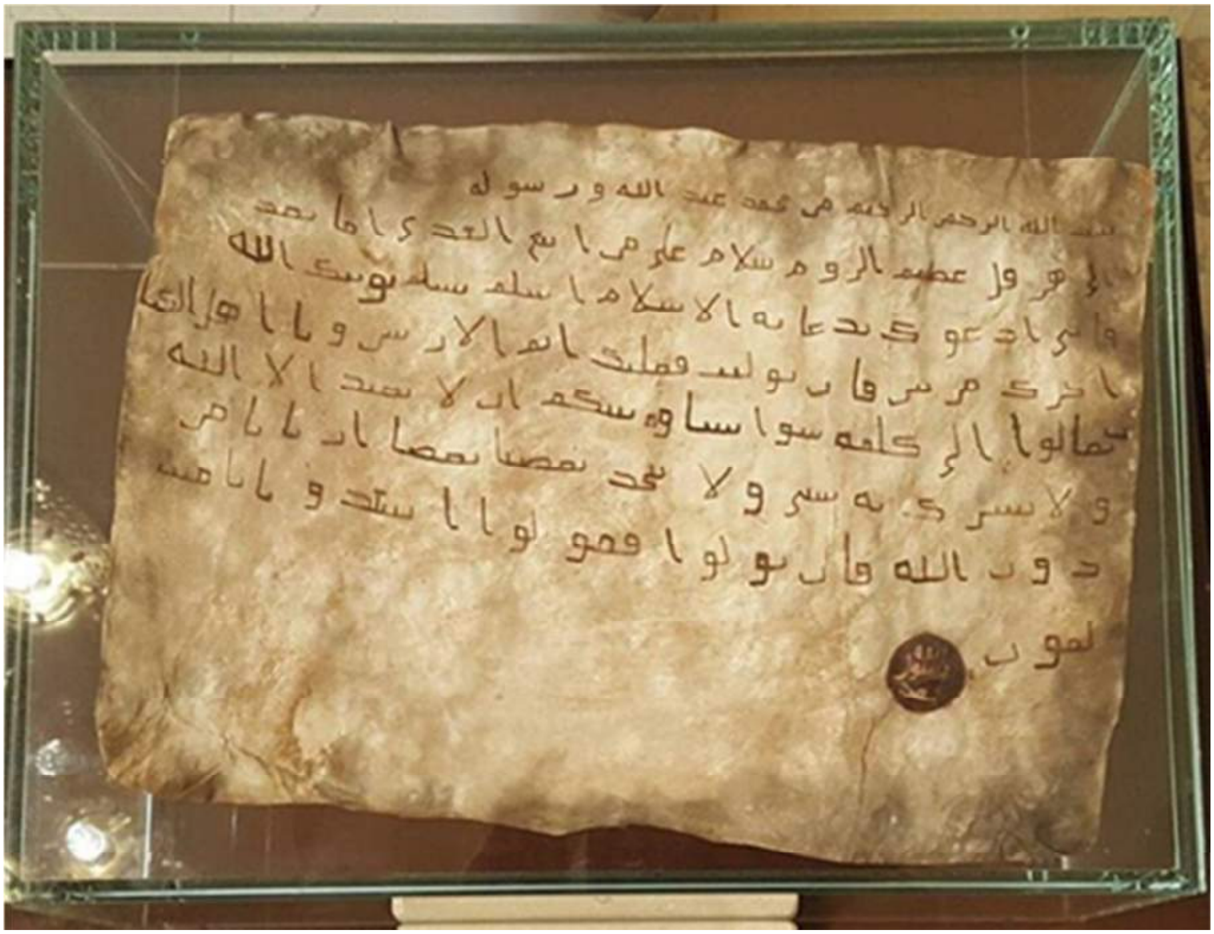

تصویر ا۔ ہرقل کے نام مکتوب مبارک جواب اردن میں قومی عجائب گھر میں محفوظ ہے

تصویر ۲۔ منذر بن ساویٰ کے نام مکتوب مبارک

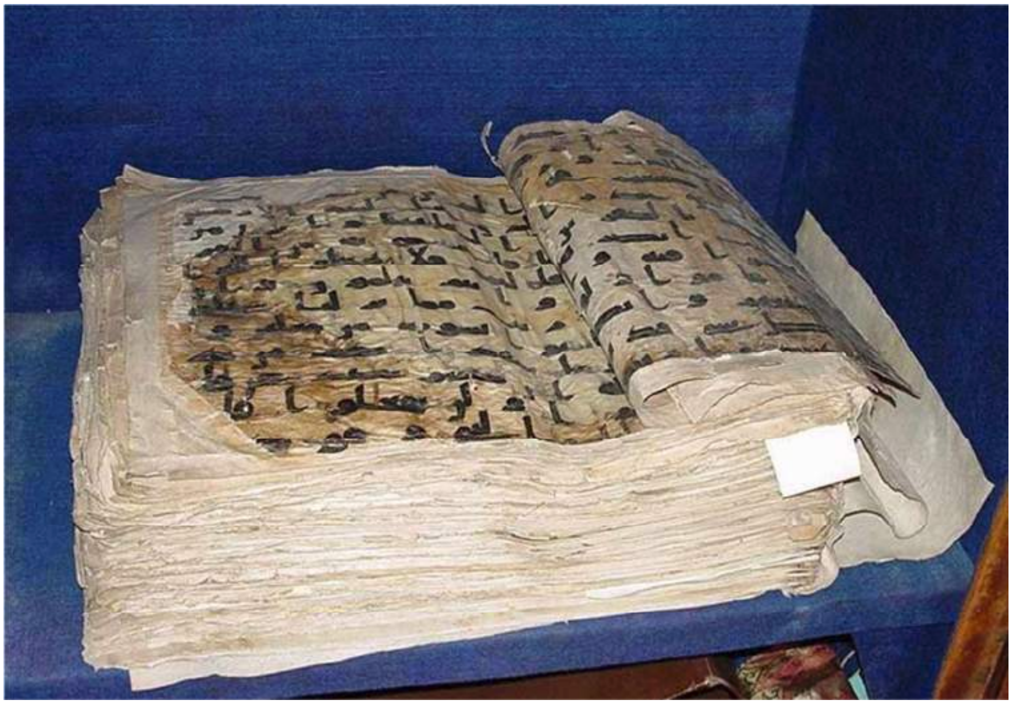

تصویر ۳۔ ازبکستان میں موجود مصحف

تصویر ۴۔ خط حجازی مکی جاف کی مکہ مکرمہ سے دستیاب پہلی صدی کی جامع طرز

تصویر ۸۔ جبل سلع پر خلافت راشدہ کے ابتدائی برسوں کا کتبہ جو خط مصحف کی ابتدائی شکل ہے

تصویر ۵۔ خط حجازی مکی المدنی (خط لین) صورت میں لکھا گیا مصحف کا ورق (ویکیپیڈیا)

تصویر ۹۔ جبل سلع پر خط حجازی مکی المدنی (لین) اور خط حجازی مکی جاف کے نمونے

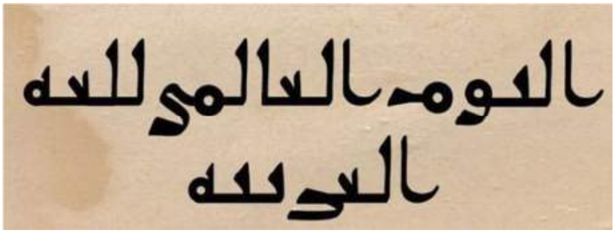

تصویر ۶۔ خط مکی المدنی (خط لین) فونٹ

تصویر ۷۔ عثمان بن عبید اللہ بن عبد اللہؓ بن عمرؓ بن الخطاب کی تحریر

تصویر ۱۰۔ خط حجازی جاف مکی میں قیس بن سعد بن زیدؓ بن ثابت الانصاری

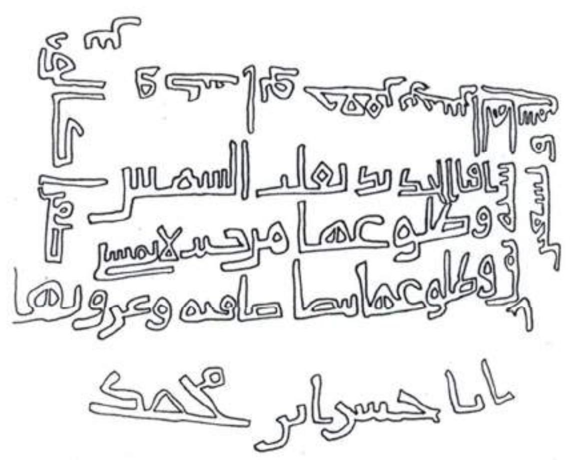

تصویر ۱۱۔ کتبہ ابو جعفر بن حسن الہاشمی (۷۸ ہجری) خط حجازی مکی جاف

(بشکریہ عبد الرحمٰن بن ناصر السعید ۲۰۱۲ء)

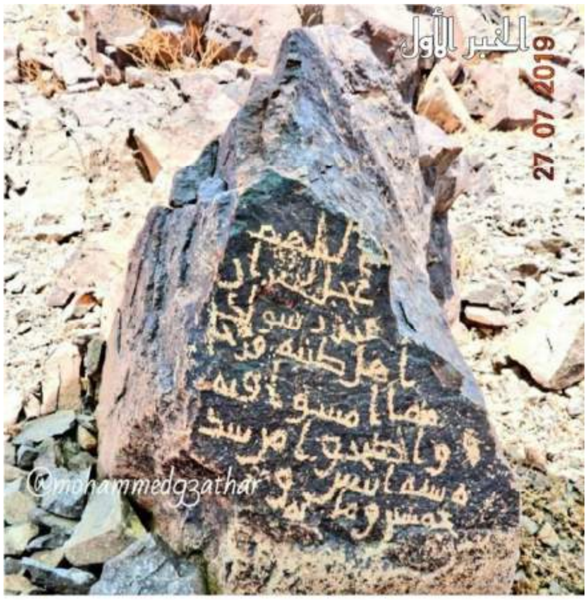

اللهم عجل لجيران قبر رسولك أهل طيبة
فرجا مما أمسوا فيه وأصبحوا من شدة
سنة إثنتين وخمسين ومائة

https://twitter.com/mohammed93athar/status/1244630265441538048/photo/1

تصویر ۱۲۔ سعودی ماہر کتبات محمد المغثاوی نے ۷۶۹ء یعنی ۱۵۲ ہجری کے چند کتبات مدینہ کے نواح سے شائع کئے ہیں کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں بھی حجاز میں ابتدائی اسلامی دور کی مکی مدنی طرز کی جاف شکل رائج تھی۔

https://twitter.com/mohammed93athar/status/877664515776819200

تصویر ۱۳۔ خط مصحف کا چٹان پر کندہ ایک نمونہ

تصویر ۱۴۔ بیسان کا اموی کتبہ جو خط حجازی مکی اور مکی المدنی کی درمیانی حالت

(تتبع Elias Khamis 2001)

http://www.worldofcoins.eu/forum/index.php?topic=30187.0

تصویر ۱۵۔ اموی سکوں میں خط حجازی مکی کا استعمال

تصویر ۱۶۔ مصحف عثمانی (از بکستان) جس کے خط کی ابتدائی شکل جبل سلع کے سن ہجری دوسری دہائی کے کتبات میں نظر آتی ہے۔

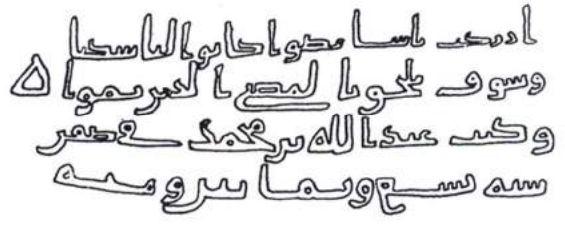

تصویر ۱۷۔ مکہ مکرمہ (۱۹۸ ہجری) کا کتبہ جس میں خط حجازی جاف میں قدرے نرمی کی طرف رجحان دکھائی دیتا ہے۔

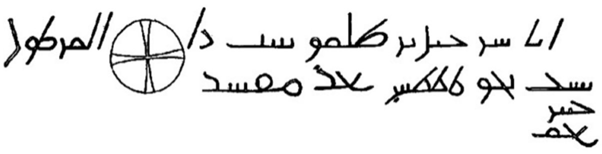

انا شرحيل بر ظلمو بنيت ذا المرطول سنت 463

بعد مفسد خيبر بعم

تصویر ۱۸۔ قدیم ترین عربی کتبہ جو دور اسلام سے دو صدیوں سے زائد قدیم ہے۔ اس میں اور مکی خط جاف میں کوئی خاص فرق موجود نہیں

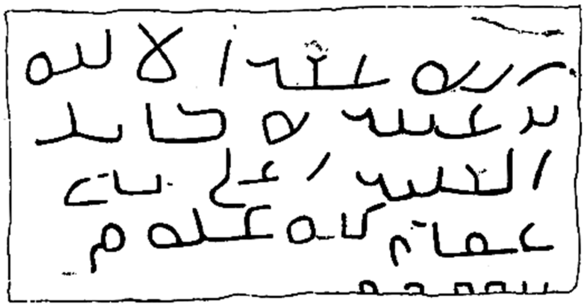

تصویر ۱۹۔ عبید اللہ الکاتب کا قبل از اسلام کا عربی کتبہ (ام جمال)۔ اس میں سریانی طرز نمایاں ہے۔

Letter of the Holy Prophet Muhammad (S.A.W.) sent to Negus, King of Ethiopia

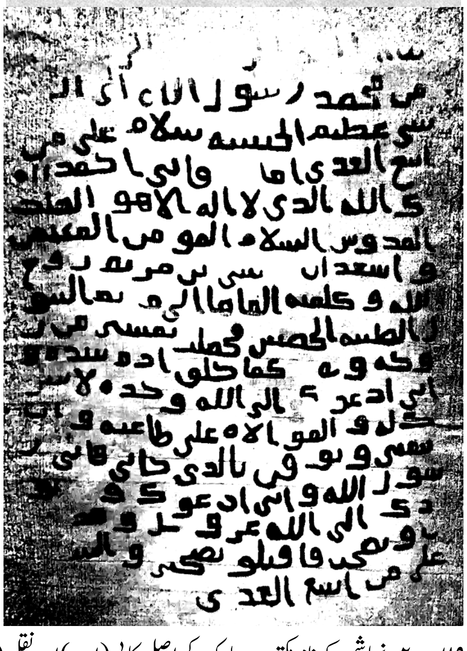

تصاویر ۱۹ اور ۲۰۔ نجاشی کے نام مکتوب مبارک کی اصل کاپی (اوپر) اور نقل (نیچے)

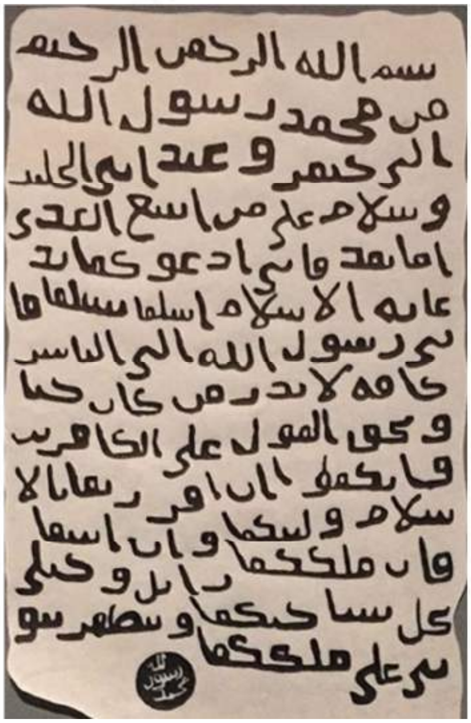

تصویر ۲۱ اور ۲۲۔ ابنا جلندی کے نام مکتوب مبارک۔ چربہ (اوپر)

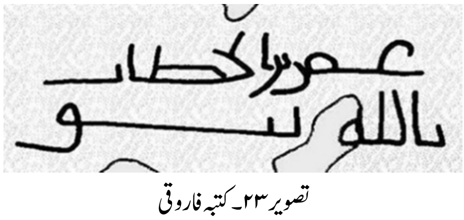

تصویر ۲۳۔ کتبہ فاروقی

بسم الله انا زهيركتب زمن توفے عمر سنة اربع وعشرين
(۲۴ ہجری)

۲۴۔ نقش زہیر

تصویر ۲۵۔ خلافت راشدہ کے دور کا مصری پپائرس جس پر ابتدائی خط جاف میں تحریر موجود ہے (ویکی پیڈیا)

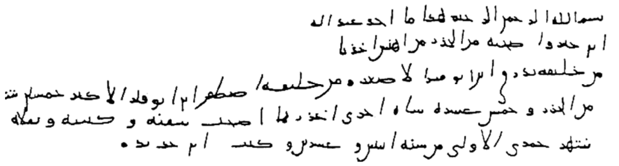

تصویر ۲۶۔ اہناس پپائرس (۲۲ ہجری)

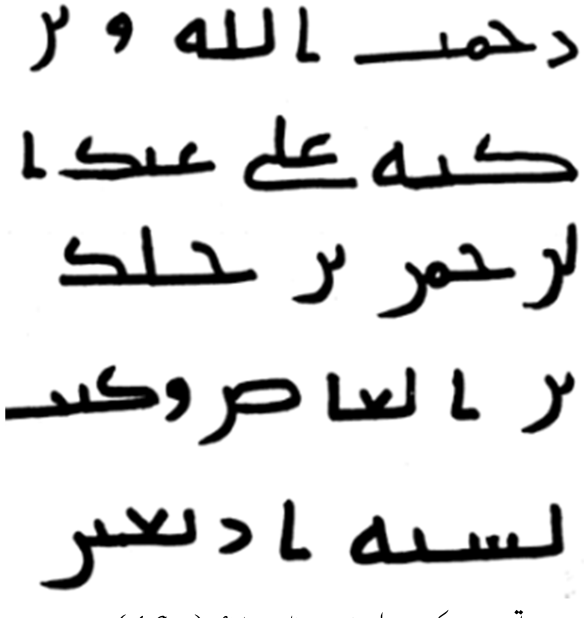

تصویر ۲۷۔ کتبہ عبد الرحمان بن خالد بن العاص (۴۰ ہجری)

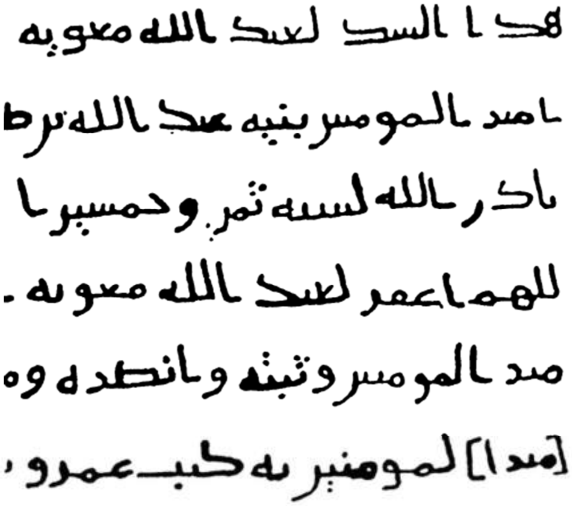
تصویر۲۸۔ سد معاویہ (۵۸ ہجری)

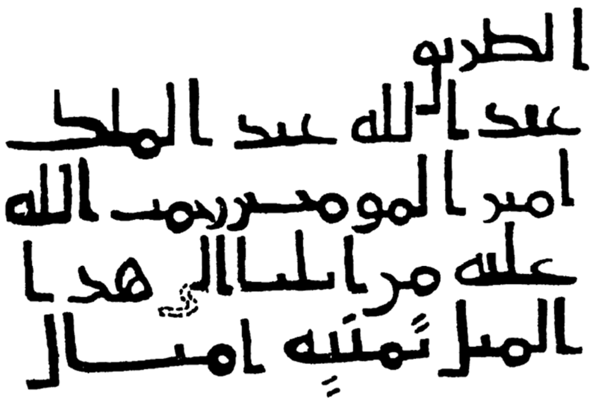
تصویر۳۱۔ اموی سنگ میل پر خط حجازی مکی

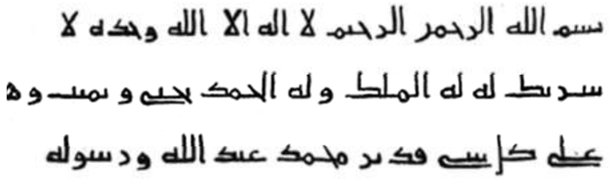
تصویر۳۲۔ اموی دور میں تعمیر کردہ مسجد الاقصیٰ میں خط حجازی جاف کی خطاطی

تصویر۲۹۔ طراز نامی کپڑے پر مروان بن عبدالملک کی شاہی اموی تحریر

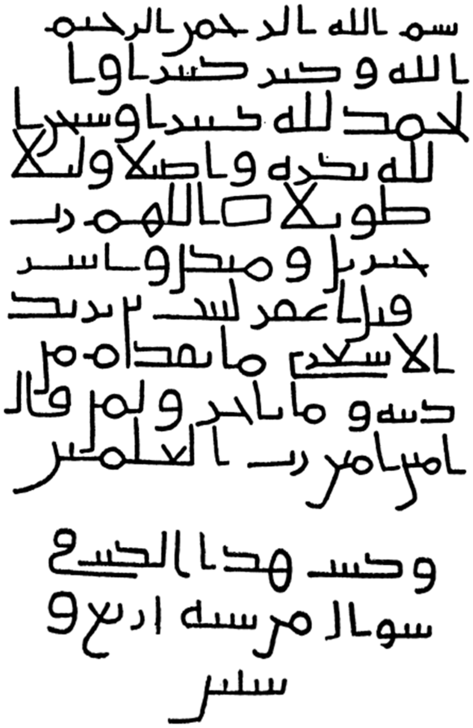
تصویر۳۰۔ ابن یزید الاسدی کا کتبہ (۶۴ ہجری)

تصویر۳۳۔ صدی ہجری کے اختتام کے قریب حجاز میں خط حجازی مکی المدنی

(سعودی انسائیکلوپیڈیا)

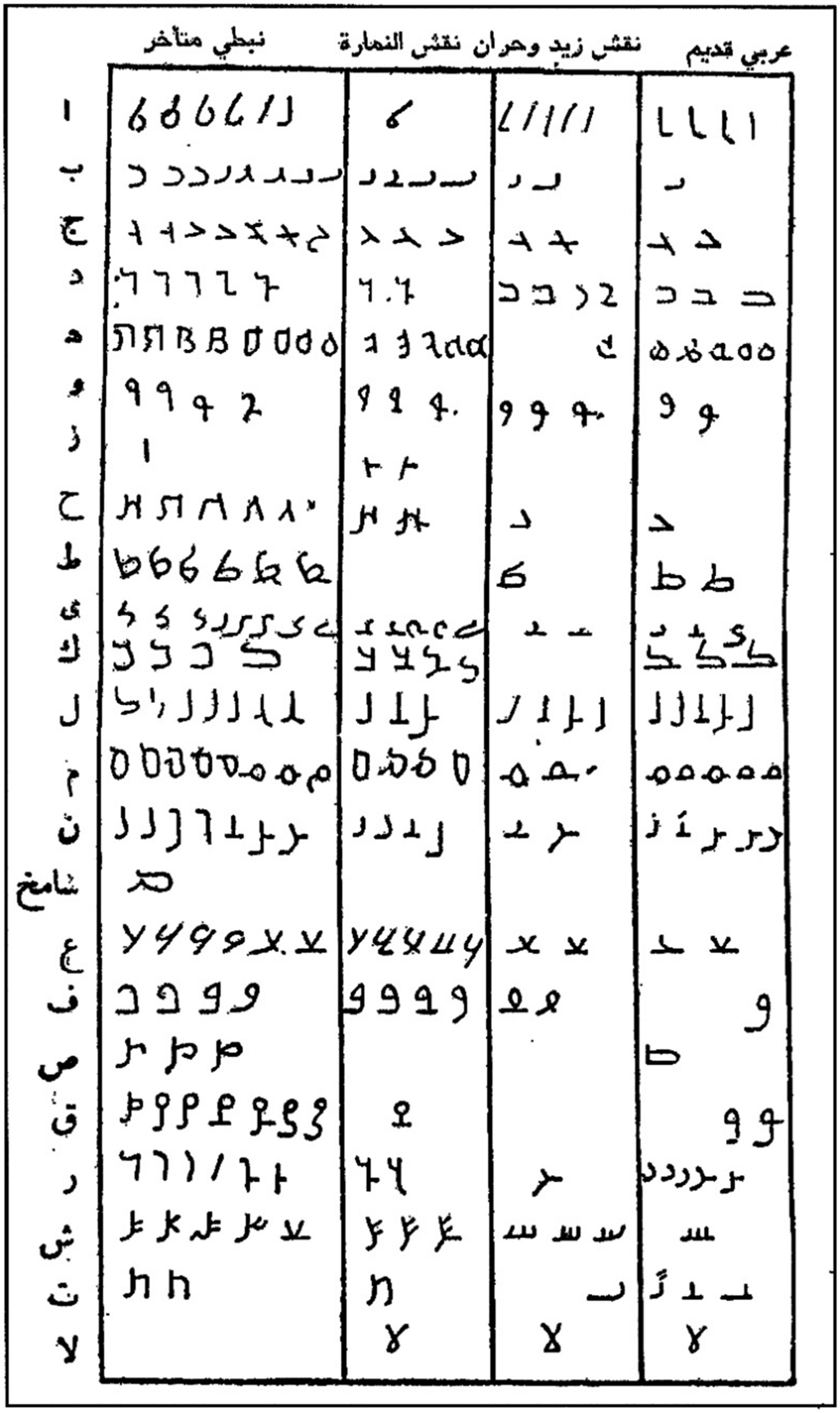

جدول ۲۔ ابتدائی حجازی مکی جاف رسم الخط اور اس کا نبطی سے تعلق

	کتبہ شرجیل بن ظلمو (۴۶۳ءیا۵۶۸ء)	مکتوب بنام منذر بن ساوئ (۹ ہجری بطابق۶۰۹ء)	کتبہ زہیر (۲۴ ہجری بطابق ۶۴۴ء)	کتبہ عبدالرحمٰن بن خالد بن العاص (۴۰ ہجری بطابق ۶۶۰ء)	کتبہ مسجد اقصیٰ
ا					
ب۔ت۔ث					
ج۔ح۔خ					
د۔ذ					
ر۔ز					
س۔ش					
ص۔ض					
ط۔ظ					
ع۔غ					
ف					
ک					
ق					
ل					
لا					
م					
ن					
و					
ھ					
ے					

جدول ۳۔ قدیم ترین عربی تحریر سے لے کر مسجد اقصیٰ کے عربی کتبات تک (مظفر احمد ۲۰۲۲)

	کتبہ شرجیل بن ظلمو (۴۶۳ء یا ۵۶۸ء)	کتبہ زہیر (۲۴ ہجری بمطابق ۶۴۴ء)	کتبہ عبدالرحمٰن بن خالد بن العاص (۴۰ ہجری بمطابق ۶۶۰ء)
ا		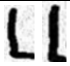	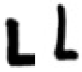
ب۔ت۔ث	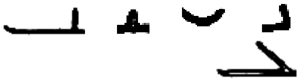		
ج۔ح۔خ			
د۔ذ			
ر۔ز			
س۔ش			
ص۔ض			
ط۔ظ		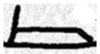	
ع۔غ	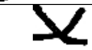	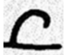	
ف			
ک			
ق		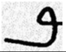	
ل		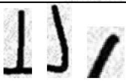	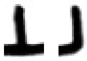
لا			
م			
ن	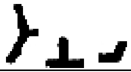		
و			
ھ			
ے			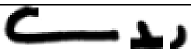

جدول ۴۔ قدیم ترین عربی کتبے سے پہلی صدی عیسوی کے عربی کتبات کا تقابل

جدول ۵۔ دور بنی امیہ میں خط حجازی کا ارتقاء

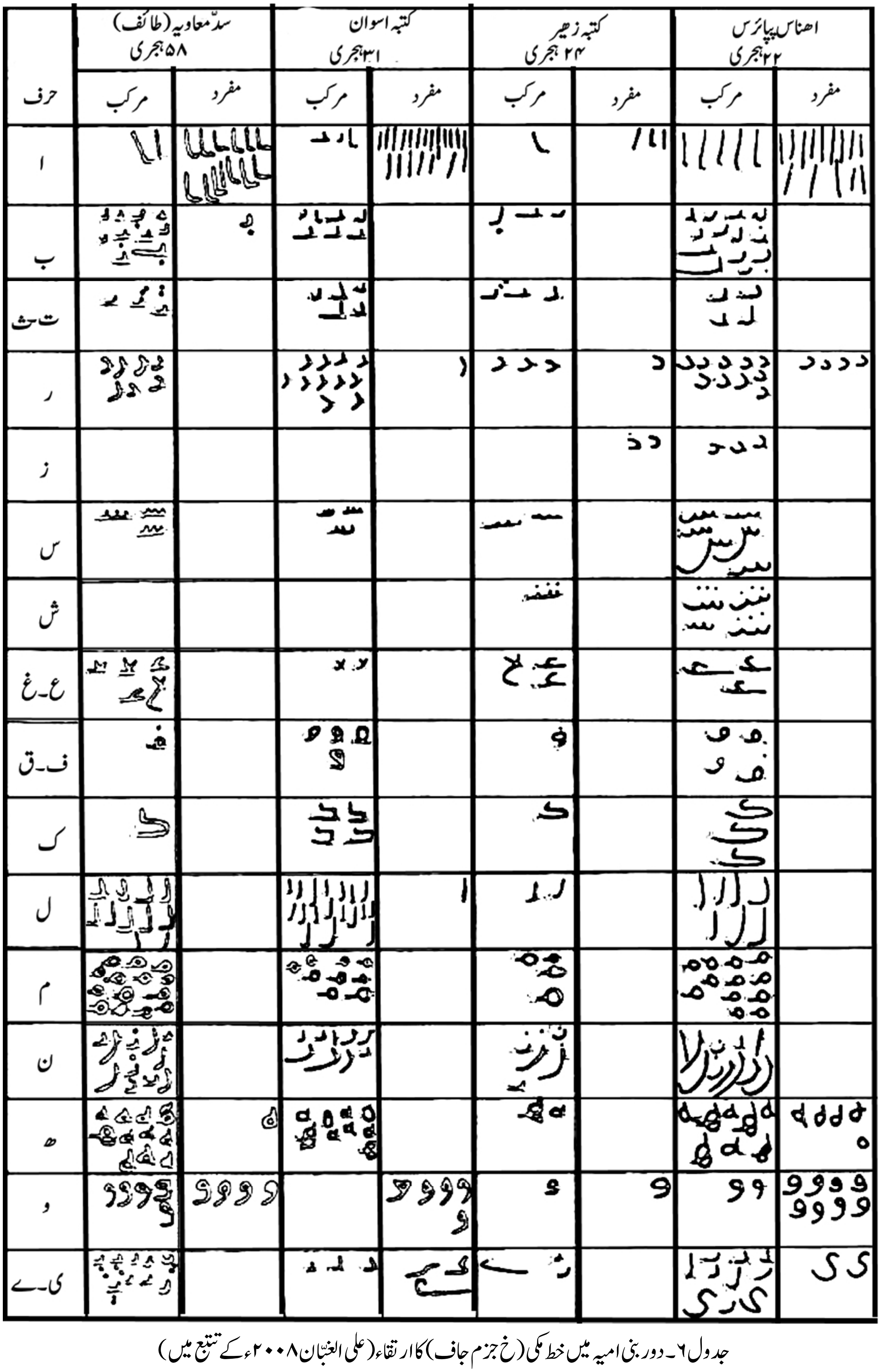

جدول٦۔ دور بنی امیہ میں خط مکی (خ جزم جاف) کا ارتقاء (علی الغبّان ۲۰۰۸ء کے تتبع میں)

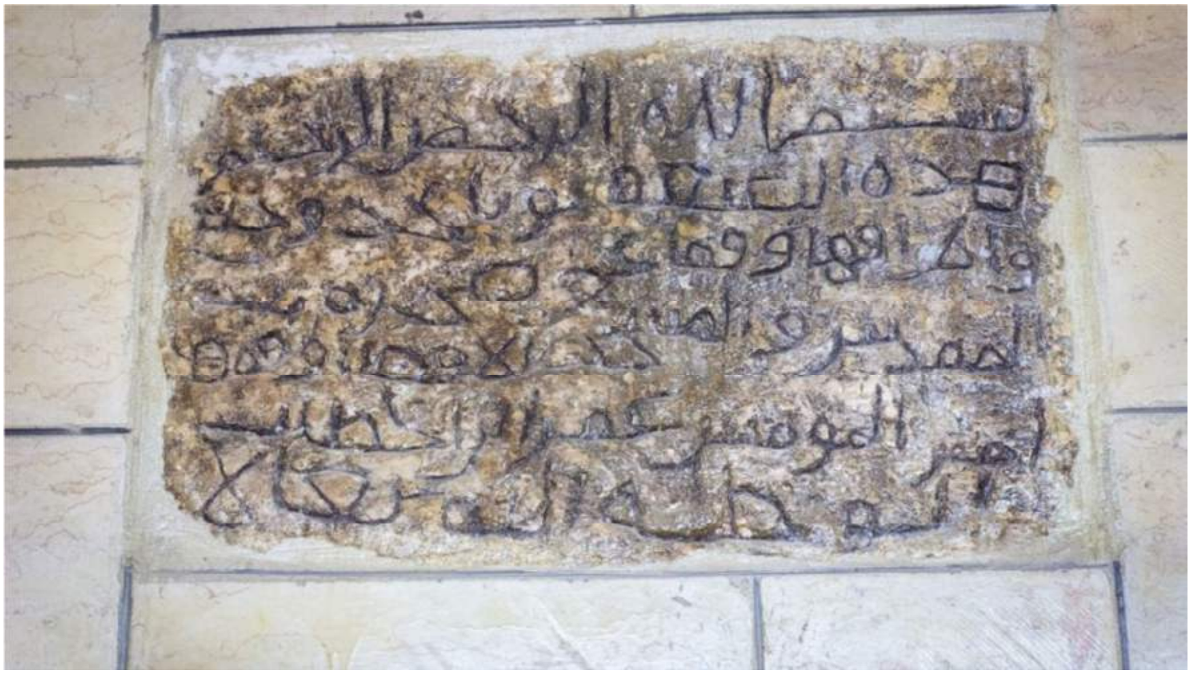

تصویر۳۴۔ یروشلم میں فتح یروشلم کے زمانے کا کتبہ

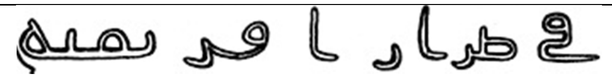

تصویر۳۵۔ مانچسٹر میوزیم میں اموی طراز کا ٹکڑا

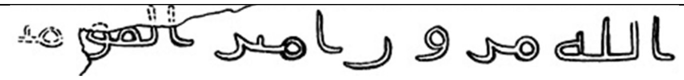

تصویر۳۶۔ لندن میں اموی طراز کا ٹکڑا

اموی طراز کپڑے کی ایک قسم تھی جس پر خط جاف میں خط تحریر کی مشارکت سے عبارتیں رقم کی جاتی تھیں

تصویر۳۷۔ سعودی عرب سے ملنے والا پہلی صدی ہجری کا خط حجازی مکی المدنی کتبہ

تصویر ۳۸۔ آذربائیجان میں ابتدائی خط حجازی سے ملتے جلتے خط میں تحریر کردہ عبارت جواب جارجیا میں موجود ہے

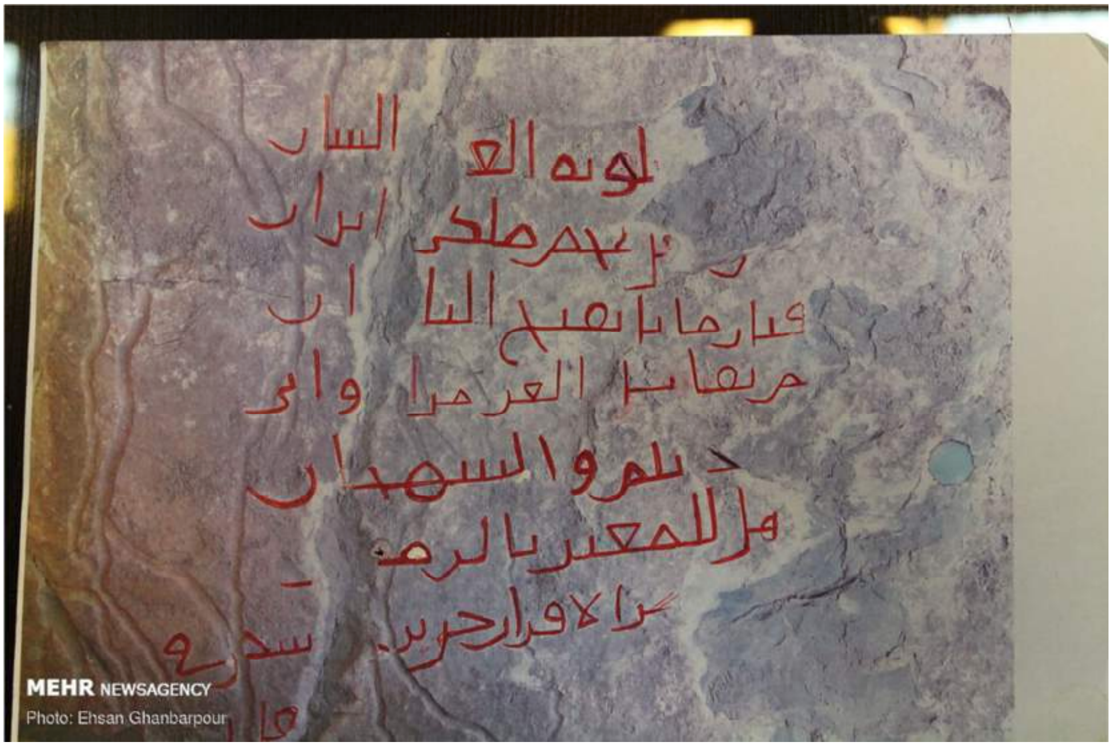

تصویر ۳۹۔ ایران سے ملنے والا ایک خط حجازی کا کتبہ جس کی تاریخ معلوم نہیں

کشمیر کے آثار قدیمہ موریہ غلبے سے مقامی راجاؤں تک

آسیہ مریم

Archaeology of Kashmir; from Mauryan Occupation to Local Rajas

Asia Maryam

ARTICLE INFO **ABSTRACT**

Keywords:
Kashmir
Archaeology

Archaeological evidence suggests that Kashmir was first time occupied by Mauryans. Later Kushans , Sakas and other ruling dynasties in South Asia extended their sway over the Valley and surrounding mountainious regions of Kashmir. This research article analyse the archaeological evidence of these occupational periods retreaved so far from archaeological sites of Kashmir.

خلاصہ: آثاریاتی شہادت سے پتہ لگتا ہے کہ کشمیر پر سب سے پہلے موریہ حکمرانوں نے قبضہ کیا۔ یہ قبضہ زیادہ تر جنوبی کشمیر تک محدود تھا۔ بعد ازاں ہند باختریوں نے جنوبی کشمیر، کشانوں نے شمالی کشمیر اور اسی طرح دیگر شاہی خانوادوں نے کشمیر کے مختلف مقامات تک اپنا اقتدار بڑھائے رکھا۔ اس تحقیقی مقالے میں ان ادوار کے بارے میں کشمیر میں اب تک دستیاب ہونے والی آثاریاتی شہادت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ:
کشمیر
آثاریات

کشمیر اس سے زیادہ حیران کن ہے جتنا اس کو قریب سے جاننے والے یا ان جاننے والوں کے قارئین اسے سمجھتے ہیں۔ کننگھم کی رائے یہ ہے کہ ٹالمی (بطلیموس) نے جس circa autem Bidaspum Pandovorum region (بِد آسپا دریا پر پانڈوؤں کی مملکت) کا ذکر کیا ہے وہ دراصل کشمیر ہے (Cunningham1848:3)۔ یہاں Bidaspum (بِد آسپّم) دریائے جہلم یعنی وتستا کو کہا گیا ہے۔ پانڈوؤں سے منسوب بِد آسپم دریا کی اس وادی اور اس وادی کی بیرونی ڈھلانیں "کسپ یا کشف" بائبل کا کاسیفیا (عذرا باب ۸، جملہ ۱۷)، بطلیموس کا kaspeiria (Ptolemy vii, i, 42) اور ہیروڈوٹس کا kaspatyros ایک ہی مقام ہیں یا نہیں یہ کام ابھی جغرافیہ نویسوں کے ذمہ باقی ہے۔ Vigne G.T. نے البتہ Sir William Jones کے حوالے سے کشپ رشی کے قصہ اور اس یونانی نام میں تعلق کا ذکر کیا ہے (Vigne 1842:45)۔ فارسی تواریخ کشمیر کا کوہِ کشف، پنڈت کلہن کی راج ترنگنی کا کشیپ رشی سے منسوب کوہستان (Stein 1899: 11-13)، بائبل کا کسیفیا یا کاسیفیا اور کاسپاٹائروس ہمالیہ کے پہاڑوں میں پنجاب اور تبت، جموں اور گلگت و بلتستان کے درمیان پہاڑی ڈھلانوں میں گھری ہوئی سطح مرتفع ہے جس کی شکل انگوٹھی میں نگینہ جڑنے کے پیالے کی سی ہے۔ اس پیالے میں رہنے والا قدیم انسان اس وادی میں محصور رہا اور نارسائی کے باعث ایک الگ تہذیب لے کر ہمسایہ خطوں سے الگ تھلگ پروان چڑھا ہے۔ اس پیالے میں گزشتہ چند لاکھ برس میں پانی بار بار بھرا ہے اور کئی بار انسانی آبادی پانی اترنے پر نئے سرے سے پنپی ہے۔ یہاں پر قدیم حجری ادوار آس پاس کے میدانی علاقوں کی نسبت بہت تاخیر سے آئے۔ وادیٔ کشمیر جدید حجری دور سے نکل کر بڑی سنگی لاٹوں اور لوہے کے دور سے گزر کر موریہ دور تک پہنچی۔ کشمیر کے قدیم ترین تاریخی ماخذ نیلہ مت پُران کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موریہ دور سے قبل کا کشمیر ایک ایسی دور دراز وادی تھی جہاں مقامی لوگ پانیوں میں پھرتے اپنا کونڈا آبی ناگوں کے درمیان لکڑی کے بجروں اور تختوں پر زندگیاں بتا دیتے تھے۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر کہیں کہیں ان سادھوؤں سنتوں اور "ناتھوں" کی ریاضت گاہیں تھیں جو کلہن پنڈت کے بقول "گرڑ سے بھاگ کر" اس وادی میں پناہ لیتے تھے۔ کشمیر کی سیاسی تاریخ ابتداء سے ہی دو الگ الگ خطوں میں بٹی رہی ہے۔ ان میں سے ایک سیاسی اکائی جنوبی کشمیر یا مراج اور دوسری شمالی کشمیر یا کامراج کہلائی۔ ان دونوں سیاسی اکائیوں کے بیچ دریائے جہلم ایک سرحد تشکیل دیتا تھا جس کی دونوں جانب دو الگ الگ ریاستیں لمبا عرصہ قائم رہیں۔

موریہ کشمیر میں

کشمیر کے تاریخی ماخذوں اور آثار قدیمہ دونوں یہ شواہد پیش کرتے ہیں کہ کم از کم اشوک کے دور سے موریہ حکمران جنوبی وادئ کشمیر یعنی مراج میں اپنی سیاسی حیثیت مضبوط کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ بیج بہاڑا میں سمیتھان کے ڈیڑھ کلو میٹر طویل اور چھ ٹیلوں پر پھیلے شہر کے کھنڈرات بتاتے ہیں کہ موریہ سلطنت نہایت سنجیدگی سے جنوبی کشمیر میں قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کشمیری مؤرخ کلہن نے پراناادھشٹانا کو جو سری نگر میں تختِ سلیمان کے عقب میں تین تین میل تک پھیلا ہوا کھنڈرات کا ایک سلسلہ ہے کشمیر میں موریاؤں کا دارالحکومت لکھا ہے لیکن ابھی تک وہاں جتنی بھی کھدائی ہوئی ہے اس سے موریہ تمدن کے مادی اثرات بر آمد نہیں ہوئے۔ شمال کی طرف موریہ آثار نہ ہونے کے برابر ہیں جبکہ جنوب میں موریاؤں کی موجودگی کے کافی شواہد موجود ہیں۔ یہ موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ موریہ دور کا آغاز کشمیر میں جنوبی درنگوں (درّوں) کے ذریعہ ہوا۔

بیج بہاڑا میں سمیتھان کی کھدائی نے جو 1.5 کلو میٹر کے لگ بھگ رقبے پر پھیلا ہوا شہر ہے کشمیر کا جو مادی ثقافتی پروفائل مہیا کیا ہے اس کے مطابق سات سو سے پانچ سو برس ق م تک تو جنوبی کشمیر میں شمالی سیاہ مجلیٰ ظروفی روایت سے پہلے کا دور چل رہا تھا۔ سمیتھان فیزII میں ۵۰۰ سے ۳۰۰ ق م تک شمالی سیاہ مجلیٰ ظروف (NBPW) کی ٹھیکریوں کی موجودگی کشمیر کے گنگا کی وادی سے جہاں یہ ظروفی روایت ۶۰۰ سے ۱۰۰ ق م تک موجود رہی ہے موریہ دور (c. 324 - c. 185 BC) میں روابط کا پتہ دیتی ہے (Agrawal 1998: 76; Chakrabarti 1992: 62-63;)۔ یہاں NBPW پلین گرے وئیر اور ریڈ وئیر کے ساتھ ملی جلی ہے (Agrawal 1998: 76)۔ اگرچہ آرکیالوجکل سروے آف انڈیا کی ٹیم نے بھی بارہ مولا مظفر آباد سڑک پر دو اثری مقامات پر NBPW ٹھیکریاں اور کشان مواد دیکھا (Mitra 1984: 16-17) لیکن یہ ان مقامات کا نام پتہ بتانے میں ناکام رہی۔ Lahiri کی یہ رائے کہ موریاؤں نے ٹیکسلا سے بارہ مولا راستے کے ذریعہ کشمیر میں نفوذ کیا (1992: 270-273 Lahiri) محلِ نظر ہے اور قرینِ قیاس یہی ہے کہ جنوبی کشمیر میں موریہ نفوذ سیالکوٹ اور جموں کے راستے سے ہوا۔

کلہن کے بقول اشوک نے بیج بہارا میں دو مندر بنوائے۔ ہیون تسانگ کے بقول اشوک نے کشمیر میں چار تبر کی سٹوپے بنوائے اور کشمیر سنگھا کو بخش دیا۔ اشوک کشمیر کے سروستی وادین بدھوں کا مخالف تھا اور اس نے مدھیہ ناتیکا کو کشمیرا گندھارا میں اصل عقیدہ کی تبلیغ کے لئے بھیجا تھا لیکن کہتے ہیں کہ آخری عمر میں اس کا رجحان اس فرقہ کی طرف ہو گیا تھا۔

ہند باختری دور

سمیتھان فیزIII ہند باختری دور سے تعلق رکھتا ہے جس کی نمائندگی دوسری صدی ق م سے لے کر پہلی صدی عیسوی پر محیط ایک دبیز رہائشی ملبہ کی تہہ سے ہوتی ہے۔ اس تہہ میں مختلف اقسام اور شکلوں کی ٹھیکریاں ملی ہیں۔ ہند باختری چاندی کے سکے اور پنچ مارک سکے ملے ہیں۔ دو پختہ مٹی کے سر اور ایک ہند باختری مہر ملی ہے جس پر دیوتا کی شبیہ ہے (Agrawal 1998: 80; Mitra1983b: 21-23; Shali 1993: 120) اور نامعلوم کاسٹ کے تانبے کے سکے ملے ہیں یہاں سے مہریں اور یونانی طرز کی چھوٹی مورتیں ملی ہیں۔ یونانی اثر کی مورتوں پر ٹیکسلا اور گندھارا کا نہیں بلکہ باختر کا اثر معلوم ہوتا ہے اور ان کا زمانہ پہلی صدی ق م سے دوسری صدی عیسوی تک کے ہیں (Siudmak2013:43)۔ تاہم باہر سے درآمدہ آرٹ میں گندھارا اور متھرا طرزوں میں سے دونوں کی کچھ نہ کچھ نمائندگی پائی گئی ہے۔ آثاریاتی شہادت کی بنیاد پر یہ کہنا قرینِ قیاس ہے کہ سمیتھان مراج یعنی جنوبی کشمیر کا صدر مقام اور ہند باختری یونانی دور میں ایک ہند باختری شہر تھا۔ جس وقت پنجاب میں ملندا (Menander) نامی ہند باختری حکمران کشمیر سے صرف بارہ یوجین کے فاصلہ پر بدھ عالم ناگاسینا سے سوال جواب کر رہا تھا تو غالباً اس وقت وادئ کشمیر میں یہی شہر ہند باختری صدر مقام تھا۔ بامزی نے رائے دی ہے کہ کلہن کی تاریخ میں بیان کردہ اشوک کی نسل کے آخری راجہ نریندرا سے مینانڈر مراد ہو سکتا ہے جس کے دور میں راج ترنگنی کے مصنف کے بقول سیدیمان (سندیمان) نامی ایک بزرگ باہر سے کشمیر آیا اور اس نے نریندرا سے مذہبی مکالمات کئے۔ ان

مکالمات کے بعد نریندرا سیدیمان کے ہمراہ کشمیر سے چلا گیا اور اقتدار کشانوں کے سپرد کر دیا (Bamzi 1994:81)۔

تصویر ا۔ سونے کی ۳۸ ملی میٹر کی ہیئت جس کے ہاتھوں میں ایک صحیفے پر یونانی میں تھیا (دیوی) لکھا ہے۔ کشمیر پہلی صدی ق م پہلی صدی عیسوی (تصویر بشکریہ Siudmak2013)

ساکا دور

کننگھم نے بارہ مولا اور دریائے جہلم کے درمیان سے دریائے جہلم کے کنارے سے بڑی تعداد میں Azes اور Azilises کے سکوں کی دریافت ریکارڈ کی (Cunningham, Coins of Indo Scythians p.44)۔ ساکاؤں نے غالباً ٹیکسلا اور سیالکوٹ سے کشمیر پر اپنا تسلط قائم رکھا۔ کشمیر اور گردونواح پر ساکا حکمرانی کے مبہم سے حالات ہمیں بھوشیہ مہاپران اور راجہ شالباہن کی پنجابی لوک داستان میں ملتے ہیں۔

کشان دور

سمیتھان فیز IV پہلی سے پانچویں صدی عیسوی پر محیط ہے۔ راج ترنگنی از کلہن پنڈت میں بھی کشمیر کے راجہ نریندرا سے اقتدار کنشک، زشک اور ہوشک نامی تین ترکستانی شہزادوں کو منتقل ہونے کا واضح تذکرہ موجود ہے۔ یہ واضح طور پر کشمیر پر کشان حکومت کی طرف اشارہ ہے۔ آثاریات کا علم بھی پوری طرح سے کلہن کی تائید کرتا ہے۔ کنیش پور میں بھی جس کے بارے میں کلہن لکھتا ہے کہ اسے کنشک نے بسایا اور جو سرینگر سے ۵۰ کلو میٹر بارہ مولا میں دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر واقع ہے دو جدید حجری ادوار کے بعد تین ادوار (فیز III تا V) میں کشان دور کے ابتدائی تاریخی آثار ملے ہیں (Indian Archaeology 2004: 30)۔ کنیش پور سے ملنے والی برتنوں کی ٹھیکریاں سرکپ ٹیکسلا کی ٹھیکریوں سے مشابہہ ہیں۔ کنیش پور کے آثاریاتی مقام کی کھدائی بی۔ آر۔ مانی نے صرف ایک سیزن میں کی (Indian Archaeology 2004, Mani 2000:30-40)۔ بارہ مولا میں ابتدائی تاریخی دور کی برتنوں کی ٹھیکریاں، سٹرکچرل ریزیڈیو، پختہ مٹی اور پتھر کے مصنوعات ہاروان، سمیتھان، کنیس پور، اشکر اور ٹیکسلا و شمالی ہمسایہ علاقوں کی طرح کی ہیں۔ پتھر کے پیالے باقی مقامات کی نسبت بارہ مولا میں زیادہ ملتے ہیں یعنی کل نو مقامات پر۔

کشان اقتدار وادی میں کلہن کے بقول ۴۱ برس تک قائم رہا۔ کنشکا کے کشمیر آنے اور تیسری یا چوتھی بدھ کونسل کرانے کا ذکر بدھ مأخذوں میں ملتا ہے۔ ہیون تسانگ نے بھی چھٹی صدی میں کنشک کے ذکر کو وادی میں موجود پایا۔ کونسل کے چھ ماہ میں کنشکا اور ناگ ارجن بھی وادی میں موجود تھے۔ چینی ذرائع سے بھی اس دور میں شمالی کشمیر کے کشان قبضہ میں ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ چینی ذرائع کے مطابق Dayuezhi قبائل کی بڑی شکست کے ایک سو برس بعد Qiujiuque (کجولا) یبگو نے باقی چار یبگوؤں کو زیر کر کے اقتدار سنبھالا اور ملک کو Guishuang یعنی کشان کا نام دیا۔ اس نے Jibin پر بھی قبضہ کیا۔ اسی برس کی عمر میں اس کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹا Yangaozhen کشان کا بادشاہ ہوا (Fan Ye 1965: 2920-2921)۔ جبن کے محل وقوع کے بارے میں ماہرین نے کافی قیاس آرائیاں کی ہیں لیکن جبن کا نام ہمیں چینی ذرائع سے باہر صرف وادی کشمیر کی بیرونی پہاڑیوں کے لئے مستعمل ملتا ہے۔ امیر تیمور کے دور تک بیرونی کشمیر یعنی درواا بھیہ سارا کے بڑے حصے کو جبن کہا جاتا تھا جیسا کہ ظفر نامہ میں ذکر ہے۔ آجکل اس علاقے کو چب یا چبال کہا جاتا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ کشمیر میں کشان آثاریاتی مقامات کا مراج یعنی شمالی کشمیر میں ملے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کشان کشمیر میں مظفر آباد بارہ مولا سڑک اور مغربی درنگوں کے راستے اپنا اقتدار قائم رکھے ہوئے تھے جبکہ مراج یعنی سمیتھان کے تحت جنوبی علاقہ میں ان کا اثر محدود تھا۔ اجمل شاہ کے تحقیقی مقالہ کی تحریر تک کشمیر میں ۶۸ کشان اثری مقامات دریافت

ہو چکے تھے۔ جن کا نقشہ اجمل شاہ نے مہیا کیا ہے۔ ان میں سے ہاروان، سمیتھان، اشکر اور کنیس پور کی کھدائی ہوئی ہے۔ جبکہ ہتمُر، ہونیار-لترو، گُرویت، وانگ دوُرا اور آہن میں آزمائشی خندقیں کھودی گئیں ہیں (اجمل ۲۰۱۳ء ص ۲۱۶)۔ سب سے زیادہ اثری مقامات بارہ مولہ میں دریائے جہلم کی اطراف میں اس قدیم راستے پر واقع ہیں جو وادئ کشمیر کو لغمان کے راستے مشرقِ وُسطیٰ سے اور ٹیکسلا کے راستے جنوبی بندرگاہوں سے ملاتی ہے۔ اشکر قدیم ہوشکا پورا ہے اور کنیس پور قدیم کنشکا پورا ہے اور دونوں بارہ مولا میں واقع ہیں۔

کشمیر میں شام میں پروان چڑھنے والے رومی فن تعمیر کی موجودگی کا معمہ

ایک معمہ جس کا کوئی حتمی حل ماہرین تعمیرات اور ماہرین آثاریات ابھی تک پیش نہیں کر سکے یہ ہے کہ کشمیر میں بدھ اور ہندو ادوار کا مذہبی طرز تعمیر اور فن مجسمہ سازی مغربی یونانی۔ رومی روایات سے اخذ کردہ ہیں۔ کشمیر میں فن مجسمہ سازی کے حوالے سے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ آئی خانم سے ادیانہ، اوراشہ اور گندھارا کے راستے کشمیر پہنچا لیکن کشمیر کا فن تعمیر ایک پختہ شامی رومی تعمیری روایت کے ہنر مند کاریگروں کے ساتھ کشمیر میں وارد ہوا ہے اور اس میں نہ تو ارتقائی مراحل موجود ہیں اور نہ ہی فن مجسمہ سازی کی طرح یہ طرز تعمیر ہمسایہ علاقوں میں پائی گئی ہے۔ ابتدائی مغربی ماہرین تعمیر جو کشمیر میں وارد ہوئے انہوں نے اس حیران کن امر کو بڑی شدّومدّ کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن بعدازاں اس معاملے کو معلق چھوڑ دیا گیا۔ کشمیر کی ایک قدیم تاریخ رتناگر پران سے معلوم ہوتا ہے کہ راج ترنگنی میں مذکور وزیر سندیمان یا سندھی متی جو راجہ گوپادتیا گوپانندا کا وزیر تھا مغرب سے آنے والا ایک ماہر آرکیٹیکٹ تھا۔ اسے سلیمان بھی کہا جاتا تھا۔ الیگزینڈر کننگھم بومہ زو غار کی تعمیرات کو جہاں اس سلیمان یا سندیمان نے باقی عمر گزاری اور تختِ سلیمان کے معبد کو قدیم ترین کشمیری عمارات قرار دیتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے آغاز سے زیادہ بعد کی نہیں (Cunningham 1848:251-52)۔ وہ مارتند مندر کی تعمیر کو بھی جہاں سے پوری وادی کا منظر دکھائی دیتا ہے اسی سلیمان یا سندیمان کا کارنامہ قرار دینے کی طرف رجحان رکھتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کشمیر میں جس فن تعمیر کو وہ یونانی باختری رومی فن تعمیر کہتا ہے اور جس کے وادئ کشمیر میں مکمل صورت میں وارد ہونے کا وہ قائل ہے اس کا بانی وہ سلیمان یا سندیمان کو ہی سمجھتا ہے (ص ۲۶۹، ۲۶۲)۔ لیکن وہ پروفیسر Willis کی اس رائے سے متفق نہیں کہ کشمیری فن تعمیر میں ٹری فوئل محراب پہلی صدی عیسوی کے شامی یونانی معماروں کے کشمیر پر اثرات کا نتیجہ ہے۔ وہ تختِ سلیمان، زین العابدین کے مقبرہ اور بومہ زو کے غار مندر کو یونانی باختری فنِ تعمیر سے اخذ شدہ سمجھتا ہے نہ کہ دور دراز کے شامی یونانیوں کا مرہونِ منت۔ اس کے نزدیک کشمیری فن تعمیر خالص یونانی ہے، اس میں رومن آمیزش نہیں اور نہ ہی اس کا اور ہندی فنِ تعمیر کا ماخذ ایک ہو سکتا ہے (ص ۳۲۶)۔

جیمز فرگوسن (James Fergusson) کے نزدیک جو اپنے وقت کا چوٹی کا ماہرِ فنِ تعمیراتِ قدیمہ تھا اور جو یروشلم کے معبد پر ایک سند کا درجہ رکھتا تھا مارتند کا مندر عبرانی معبد کی بائبل میں دی گئی پیمائشوں پر یروشلم کے ہیکل کی نسبت زیادہ بہتر طور پر پورا اترتا ہے اس نے ۱۸۷۶ء میں اپنے مشاہدے کا خلاصہ یوں بیان کیا کہ:

> The temple itself is a very small building, being only 60 ft. In length by 38 ft. in width. The width is of the facade, however, is eked out by two wings or adjunets, which make it 60 ft. Also, it realises the problem the Jews so earnestly set themselves to solve—how to build a temple with the three dimensions equal, but yet should not be a cube. Small however, as the Jewish temple was, it was more than twice as large as this one. At Jerusalem the Temple was 100 cubits, or 150 ft., in length, breadth, and height. At Marttand these dimensions were only 60 ft. But it is one of the points of interest in the Kashmiri temple that it reproduces in plan, at least, the Jewish temple more nearly than any other known building.

یہ مشاہدہ فرگوسن نے دراصل A history of Architecture in allCountries کی جلد ۳ میں درج کیا ہے (بعض ایڈیشنوں میں ص ۲۸۶)۔ لیکن جب اسی کتاب کو James Burgess سابقہ ڈائریکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے ۱۹۱۰ میں نظر ثانی کر کے شائع کیا تو اس

میں سے یہ پیرا حذف کر دیا۔ اس کے علاوہ عبارت اور فٹ نوٹ میں سے متعلقہ جوزیفس کے حوالے اور فرگوسن کے اس نوٹ کو کہ اس نے یروشلم کے یہودی معبد پر ایک تحریر لکھی ہے جسے وہ سکیل پر ڈرائنگز کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تینوں کو غائب کر دیا گیا۔

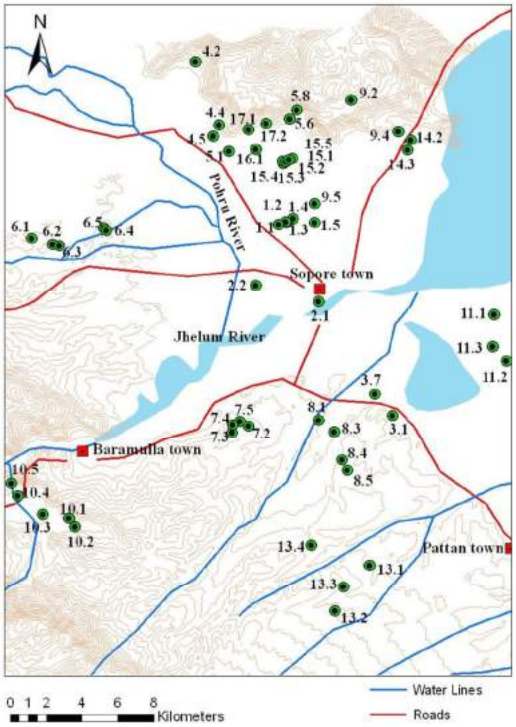

بارہ مولا کے متاخر تاریخی مقامات (بشکریہ یاٹو ۲۰۱۱ء)

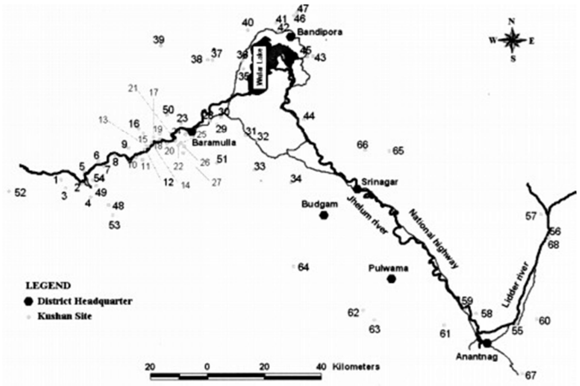

کشمیر کے کشان اثری مقامات (بشکریہ اجمل شاہ)

کشمیرا۔ گندھارا

ماہرینِ آثاریات و مسکوکات کی اکثریت کی رائے میں گونڈوفارس اوّل کو ۲۳ تا ۴۶ عیسوی کی تاریخ دی گئی ہے (Cribb, 1997: 224; Alram, 1999: 38)۔ کجولا کڈفیسز نے گونڈوفارس کے سکوں پر ضرب کی ہے اور اس کے جانشین ویما تاکتو کے جاری کردہ سوتر میگاس (منجی اعظم) کے سکوں پر گونڈوفارس کے جانشین Sases کے جانشیوں جیسے Pacores وغیرہ نے ضرب کی ہے۔ یوں کجولا کیڈفائسز گونڈوفارس اوّل اور اس کے جانشین گونڈوفارس ساسیس کا ہم عصر اور اس کا جانشین ویما تاکتو گونڈوفارس ساسیس کا ہم عصر تھا۔ کشمیرا۔ گندھارا اس زمانے میں ایک سیاسی اکائی شمار ہوتی تھی جس میں دونوں علاقے شامل تھے۔ ان میں سے کشمیر ہند پارتھیوں کے ہاتھوں سے پھسل کر بہت جلد کجولا اور اس کے جانشینوں کے قبضے میں چلا گیا جبکہ گندھارا پر کشان کنٹرول کچھ مدت بعد ہی ممکن ہو سکا۔ یہ سیاسی اور فنی تعلق اس بات کا غماز ہے کہ قدیم سنسکرت لٹریچر میں ''کشمیرا۔ گندھارا'' کو ایک سیاسی جغرافیائی اکائی یعنی ایک جانا پادا بیان کیا جانا ایک درست امر ہے (Mahabamasa 94, Baruah 200:455)۔

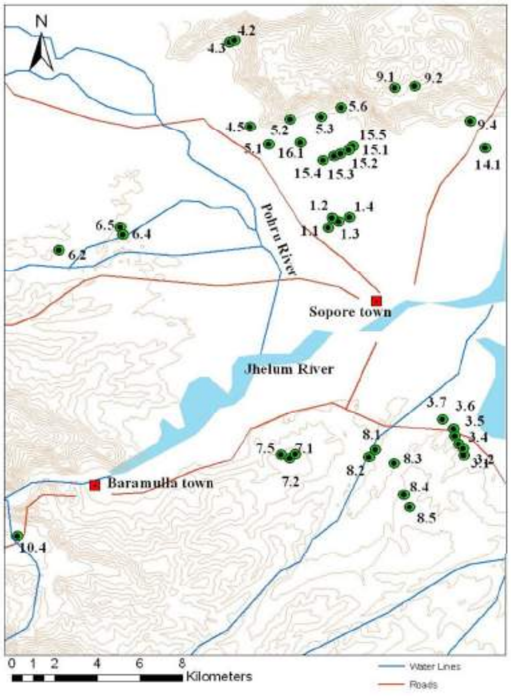

بارہ مولا کے ابتدائی تاریخی مقامات (بشکریہ یاٹو ۲۰۱۱ء ص ۲۸۰)

کشان سکے وادئ کشمیر میں کجــو لا کیڈ فسز سے واسو دیوا کے دور کے درمیان کے ملتے ہیں۔ ۱۷۰)۔۱۹۹۵ء میں محکمہ آثاریات کشمیر نے کجو بولا کیڈ فسز کے ایک سو تانبے کے سکے خریدے (شاہ ۲۰۱۳ء ص۲۱۹)۔ کشمیر کی وادی میں کجو بولا کیڈ فسز کے سکے تُرک پورہ بانڈی پورہ سے ملے ہیں (شاہ ۲۰۱۳ء ص۲۱۹)۔ کجو لا کیڈ فیز کی چھ مسکوکاتی طرزوں میں سے صرف بیل اور باختری اونٹ والی ٹائپ ہی کشمیر سے ملی ہے ۵۷۰ میں سے ۴۶۷ تانبے کے سکے کنشک کے ہیں۔ کپواڑہ میں میدان چوغل سے سکوں کا جو دفینہ سکوں کا ملا اس میں کجو بولا کید فیز کے تین تانبے کے سکے ہیں (شاہ ۲۰۱۳ء ص۲۱۹) جن سائٹوں کی کھدائی ہوئی ان میں سے صرف فی سائٹ ایک سکہ ہی دستیاب ہو سکا ہے۔ سمیتھان فیز III ہند باختری دور سے تعلق رکھتا ہے جو دوسری صدی ق م سے پہلی صدی عیسوی پر محیط رہائشی ملبہ کی ایک دبیز تہہ ہے۔ اس تہہ میں مختلف اقسام اور شکلوں کی ٹھیکریاں ملی ہیں۔ ہند باختری چاندی کے سکے اور پنچ مارک سکے ملے ہیں۔ دو پختہ مٹی کے سر اور ایک ہند باختری مہر ملی ہے جس پر دیوتا کی شبیہ ہے (Agrawal 1998: 80; Mitra1983b: 21-23; Shali 1993: 120) اور نامعلوم کاسٹ کے تانبے کے سکے ملے ہیں۔ ۲۰۰ ق م میں تیسرا یعنی انڈو گریک دور ہے جس میں ہند باختری سکے، مہریں اور یونانی طرز کی چھوٹی مورتیں ملی ہیں۔ یونانی اثر کی مورتوں پر ٹیکسلا اور گندھارا کا نہیں بلکہ باختر کا اثر معلوم ہوتا ہے اور ان کا زمانہ پہلی صدی ق م سے دوسری صدی عیسوی تک کے ہیں(Siudmak2013:43)۔

کشمیری راجے

بر صغیر کی تاریخ کو چندر گپت موریہ کی تاریخ کا تعین کر کے بین الاقوامی تاریخ سے جوڑنے والے ماہرِ مسکوکات و قدیم رسوم الخط پرنسپ نے جب انڈو سیتھین سکوں کی تیسری سیریز شائع کی تو اس میں کننگھم نے کشمیری سکے شناخت کئے (پرنسپ کا جرنل جلد ۵ پلیٹ ۳۹)۔ خود کننگھم نے ایک ہزار کشمیری تانبے کے سکے اپنی ۱۸۳۹ء کے کشمیر کے سفر میں اکٹھے کئے جن میں سے زیادہ تر بیہج بہارا سے ملے تھے (کننگھم ۱۸۴۳ ص ۱)۔ اس کے مشاہدہ کے مطابق کشمیری سکے وادئ کشمیر کے علاوہ افغانستان اور شمال مغربی ہند کے مجموعوں میں کچھ نہ کچھ ملتے تھے اور بنارس تک میں پائے گئے ہیں، پنجاب میں بہت عام تھے اور بھمبر اور راجوری میں بے شمار تھے۔ اس فٹ پرنٹ کی بنیاد پر اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ ۲۸۰ عیسوی میں کشمیری اقتدار وادئ کشمیر، راجوری اور پونچھ تک ہی محدود تھا(کننگھم ۱۸۴۳ص ۲)۔ اس نے چندراپیڑا کے اقتدار کی چینی تاریخ ۷۱۳ء کا موازنہ (جب اس نے چینی دربار سے عربوں کے خلاف مدد مانگی تھی) راج ترنگنی میں اس کے دورِ اقتدار سے کیا ہے جو اس کے نزدیک ۶۸۰ تا ۶۸۹ عیسوی ہے۔ جبکہ للیتادتیہ کا راج ترنگنی سے اخذ اس کا دورانیہ ۶۹۳ تا ۷۲۹ء چینی مأخذ میں اس کی تاریخ کے حساب سے بالکل درست ہے۔ اس سے اوپر رانادتیہ کے ۳۰۰ سال نے قباحت پیدا کی ہے۔ یہ ۳۰۰ برس شاید کلہن کے ان گمشدہ راجوں میں شامل ہیں جن کا وہ ذکر نہیں کرتا۔ پھر وہ تیسرے بکرماجیت کے ستر نجیا مہاتم کے حوالے سے اجین میں ۴۶۶ سموت یا ۴۰۹ء حکومت کرنے کی بنیاد پر اسے ماتر گپت کا مالک سمجھتا ہے اور پرورسین کو اسی زمانے میں رکھتا ہے۔ راج ترنگنی میں اس بکرماجیت کو ساکاؤں کا دشمن (ساکاری) لکھا ہے اور کننگھم اس کی تاریخ ۳۹۵ سے ۴۳۰ متعین کرتا ہے، ہرنیا اور توراماں کی تخت نشینی کی ۴۱۵ء اور ماتر گپت کی تخت نشینی ۴۳۰ء اور ۴۳۲ بشمول اس برس کا نصف اس کے کشمیر چھوڑنے کا سن بتاتا ہے۔ اور یہاں سے لے کر ۴۶۴ء تک پرورسین کا زمانہ قرار دیتا ہے جس نے سیلادتیہ کو جو بکرماجیت سوم کا بیٹا تھا شکست دی تھی (ص ۱۰)۔ ستر نجیا مہاتم سیلادتیہ کے حکم پر ۴۷۷ سموت یعنی ۴۲۰ء میں لکھا گیا تھا۔ اور اندازاً ۴۳۵ء میں پرورسین نے اسے شکست دی ہوگی (ص ۱۱)۔ اس کے اوپر ادتیہ خاندان کے چھ حکمرانوں کے ۱۹۰ برس ہیں۔ اس خاندان میں پرتابادتیہ بکرماجیت ثانی کا رشتہ دار تھا جس کا دور ولفورڈ کے نزدیک ۲۹۱ء ہے اور جو فرشتہ کے نزدیک شاپور ساسانی کا ہم عصر تھا (ص ۱۱)۔ اس سے اوپر گونردیہ خاندان ہے جس میں سے گونردا کا اندازہ کنــنگھم نے 53 4/1 برس عیسوی پر نکالا ہے۔ اور اس کے پیشرو ابھی مینو کا اندازہ 18 4/1 عیسوی اور راج ترنگنی کے ترک کنشک کو 21 4/3 ق م میں لے جاڈالتا ہے (ص ۱۲)۔ ٹرنر کے راج ترنگنی ترجمہ کے مطابق ناگ ارجن کی تبلیغ اور کنشک کی وفات ساکیہ منی کی وفات کے پانچ سو برس بعد ہوئی جبکہ مہاوانسو کے بقول اشوک بدھا کی وفات کے ۲۱۸ برس

بعد تخت نشین ہوا جو تاریخی حساب کتاب سے ۲۶۶ تا ۲۶۰ کسی وقت بنتا ہے اور ۲۶۳ مناسب تاریخ ہے (ص۱۳،۱۲)۔اس میں سے ۲۸۲ برس منہا کر کے وہ ناگ ارجن اور کنشک والے واقعات کی تاریخ ۱۹عیسوی میں نکالتا ہے۔ تبتی ماٰخذ ناگ ارجن کی تبلیغ کی تاریخ ۹ء دیتے ہیں۔مانکیالہ کے چھوٹے سٹوپا سے ۲۷ سے ۳۳ ق م کے چاندی کے رومی سکے کنشک کی تاریخ سن عیسوی کے آغاز پر متعین کرتے ہیں (ص۱۳)۔ حیدر شاہ اور حسن شاہ کے ۱۴۶۹ء کے سکوں کو ایک سو برس کے کشمیری چکر کے حساب سے ۵۸۶ برس واپس پلٹاتے ہوئے وہ اونتی ورمن کی درست تاریخ ۸۱۳ء حاصل کرتا ہے۔ یساکارا اور سنگرام دوم کی تاریخ بھی اس حساب سے درست نکلتی ہیں (ص ۱۴ اور ۱۵)۔ کشمیری تقویمی چکر کا سال ۷۹ ،اونتی ورمن کا سن وفات ۸۸۳ء ہے۔یساکارا کی وفات کشمیری چکر ۲۴ اور عیسوی ۹۴۸ ہے (ص۱۵)۔سنگرام کی وفات کشمیری چکر ۴ عیسوی ۱۰۲۸۔اننتا کی وفات کشمیری چکر ۵۷ عیسوی سال ۱۰۱۸۔اُچالا کی وفات کشمیری چکر ۸۷ عیسوی سال ۱۱۱۱ (ص۱۵ اور ۱۶) وغیرہ۔ کننگھم نے جو جدول تیار کیا اس میں کنشک کو ۲۰ عیسوی پر رکھ کر ابھی مینو کو ۱۸ء اور گونیندراسوم کو ۵۳، وبیشانا کو ۶۱، اندرجیت اور راون کو ۳۷، وبیشانا دوم ۸۰ اور نارا کو ۸۹، سدھا کو ۹۹ اور اتپالا کشا کو ۱۱۴ء پر رکھا ہے (ص۱۸)۔اس کے بعد کلہن کی دہرائی کا شکار ہو کر وہ کیدار ہن خاندان کو صدیوں اوپر لے آیا ہے (ص۱۸)۔اس نے کلہن کا یہ بیان بھی ریکارڈ کیا ہے کہ تورامانا نے اپنے سے قبل کے بالاھت نامی سکے پگھلوا دیئے اور اپنے سکہ کو دینار کا نام دیا۔یہ بات اسے چندرا گپتا وکرماجیت آف اجین کا ہم عصر دکھاتی ہے جس نے اپنے سکوں کو دینار کہا ہے (۲۵ص)۔

تاراناتھ نے ہندوستان میں بدھ مت کی تاریخ میں پہلی مسیحی صدیوں کا ایک مبہم حال بیان کیا ہے (Taranatha1990:106)۔ کنشک کے زمانہ میں ناگ ارجن نالندہ میں رہ رہا تھا۔ پھر اپنی زندگی کے آخری حصہ میں وہ ادیانہ (سوات Bde-spyod) میں رہا اور دراوالی کے برہمنوں سے مذہبی مباحثات کرتا رہا۔ اس کا دوست اچاریہ براہمنا وارارو کی ادیانہ کے بادشاہ کا شاہی پروہت تھا۔ پھر ناگ ارجن ستاوہانا بادشاہ کے ملک چلا گیا۔اسی وقت میں کالی داس نے وسنتی سے جو ادیانہ کے بادشاہ کی بیٹی تھی شادی کی تھی۔ اسی وقت میں وبھاسیکا کنالا کشمیر میں تھا اور Kumaralata Sautrantikaacaryabhattaraka جو Sautrantika اسکول کا بانی تھا ٹیکسلا میں تھا (Taranatha1990:108-117)۔یہ اسواگھوشا، ناگ ارجن اور کمارا لبھا کا ہم عصر تھا۔

تاراناتھ کے مطابق ناگ ارجن کے زمانے میں ہی ملیچھ پہلی مرتبہ کشمیر میں ظاہر ہوئے جب بھٹارکا سری لبھا کی وہاں وفات ہوئی۔ کنالا کے ایک شاگرد نے Sulika (سیلوکیا قطسیفون) سے جو توگار (تخارستان) کے پرے واقع تھا ایک مذہب لا کر اس کو اختیار کیا۔ اس نے اپنا لبادہ تبدیل کیا اور ملیچھ صحیفہ تصنیف کیا (Taranatha1990:108-118)۔اسی وقت میں خراسان میں ایک کنواری مرد سے تعلق کے بغیر حاملہ ہوئی اور اس نے ایک صحتمند بچے کو جنم دیا۔ اس ملک کے حاکم نے اس کو جلاوطن کر دیا۔ یہ شخص چار ذاتوں میں سے کسی سے بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسی کتاب پائی جو اس سے قبل پوشیدہ تھی اور Ma-ma-thar نے اس کو اس کی تعلیم دی جس سے اسے جادوئی طاقتیں حاصل ہو گئیں۔ وہ Bai-kham-pa کے نام سے ملیچھوں کا بڑا بزرگ بنا۔ اس نے ماکاہ کا سفر کیا اور Sai-da اور Tu-ru-ska کے شاہی خاندانوں کو اس عقیدہ کی تعلیم دی۔ برہمن اور کھشتری اس کے مذہب میں داخل ہوئے۔ یہ استاذ Ardho کہلایا اور ملیچھ مذہب کا بانی ہوا (Taranatha 1990:117-118)۔ تاراناتھ بتاتا ہے کہ ناگ ارجن نالندرا میں سروستی وادا فرقہ میں شامل ہوا تھا Walleser (Walleser:434,35) نے ناگ ارجن کے کنشک اور ستاوہانا کے دور میں ہونے کی دیگر رپورٹیں بھی نقل کی ہیں (Walleser: 422-23)۔اس ساری تفصیل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تاراناتھ کے ماٰخذ بتاتے ہیں کہ ۵۷ ق م میں ایک دور شروع ہوا جو پہلی صدی کے وسط میں کہیں ختم ہوا جس میں کنشکا، کالیداس، گوتامی پتر استاوہانا یا شالباہن، کنواری کا بیٹا ملیچھ پیغمبر اور کنالا کا شاگرد جو اس ملیچھ بزرگ پر ایمان لایا، سب گزرے ہیں۔ چینی بدھ ذرائع میں ایک Thuholos یا تخاری خاندان کے شخص کا ذکر ہے جس نے بدھا کے چھ سو برس بعد کشمیر پر

حکومت کی لاسین نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال شمارہ ۱۸۴۰ء میں حاکم اس کازمانہ ۵۶ عیسوی متعین کیا ہے(Lassen1840:748) ۔

****

حوالہ جات

Agrawal, R. C. (1998). *Kashmir and its monumental glory*. Aryan Books International.

Archæological Survey of India. (2014). *Indian Archaeology 2004-05: A Review*.

Baruah, B. (2000). *Buddhist sects and sectarianism*. Sarup & Sons.

Chakrabarti, D. K. (1993). *Early use of iron in India*. Oxf. U.P. (India).

Cunningham, A. (1884). *Coins of Alexander's successors in the east, Greeks, indo-scythians and Parthians*.

Cunningham, A. (1971). *Coins of the indo-scythians, Sakas & Kushans*. Indological Book House.

Cunningham, A. (2015). *An essay on the arian order of architecture, as exhibited in the temples of Kashmir*. Jaykay Books.

Fan, Y. (1965). *Hou Han Shu*. Zhonghua.

Fergusson, J. (1876). *History of Indian and eastern architecture: Forming the third volume of the new edition of the "history of architecture."*. John Murray.

Kak, R. C. (1923). *Handbook of the archaeological and numismatic sections of the Sri Pratap Singh Museum, Srinagar*. Thacker, Spink.

Kaul, B. P. N. (1994). *Culture and political history of Kashmir*. MD Publ.

Lahiri, N. (1999). *The Archaeology of Indian trade routes upto c. 200 Bc resource use, resource access and lines of communication*. Oxford University Press.

Mani, B. R. (2000). Excavations at Kanispur: 1998-99 (District Baramulla Kashmir). *Journal of Interdisciplinary Studies in History and Archaeology*, *10*, 1–21.

Mitra, D. (1984). Indian Archaeology 1981–82 A Review. *Archaeological Survey of India*, 16–25.

Shah, M. A. (2012). Early Historic Archaeology in kashmir: an Appraisal of the Kushan Period. *Bulletin of the Deccan College Post-Graduate and Research Institute*, *72-73*, 213–214.

Shali, S. L. (1993). *Kashmir: History and archaeology through the ages*. Indus.

Siudmak. (2013). *The Hindu-buddhist sculpture of ancient Kashmir and its influences*. Koninklijke Brill NV.

Stein, M. A. (1899). *Memoir on maps illustrating the ancient geography of Kaśmīr.* . Asiatic Society.

Tāranātha, Chimpa, Chattopadhyaya, A., & Chattopadhyaya, D. (1990). *Tāranātha's history of Buddhism in India*. Motilal Banarsidass.

Vigne, G. T. (1842). *Travels in Kashmir, ladak, iskardo, the countries adjoing the mountain-course of the Indus and the Himalaya, north of the Panjab: With map engraved by direction ofthe Hon. East India Company, and others illustrations* (Vol. 2). Henry Colburn.

وادی کشمیر کے مقامی راجوں کے اب تک دستیاب ہونے والے سکے

Rulers		Sources
Prehistoric Local Rule in Kashmir		Nilamata Purana Archaeological Evidence
Mauyruan Period in South Kashmir		Archaeological Evidence from Samithan in South Kashmir Rajataringani of Kalhana
Indo Greek Period in Kashmir 180BCE-30 CE		Archaeological. Art Historic, Architectural and Numismatic Evidence from South Kashmir and Jammu
Kushan Period in North Kashmir		
Vima Kadphises	**113-127 CE**	Archaeological. Art Historic, Architectural and Numismatic Evidence from Kashmir Rajataringani of Kalhana
Kanishka I	**127-151 CE**	
Huvishka	**151-190 CE**	
Vasudeva I	**190-230 CE**	
Kanishka II	**230- 247CE**	
247-400 CE		Unknow Rulers May be some of the 52 Rajas not mentioned in Kalhana's Rajataringani

Shri Narendra Kidara (400-500 CE)
Gold dinar. 'Narendra', 7.40g. Obv: Kushan-style king standing offering sacrifice at an altar; crude Brahmi legend Kidara under the arm. Rev: Goddess seated facing; crude Brahmi legend Shri Narendra inscribed vertically to right.
https://www.coinarchives.com/w/results.php?search=kashmir

Vinayaditya (5th century CE)
Base Gold Dinar
https://indiancoins.com/product/ancient-kashmir-karkota-or-naga-dynasty-vinayaditya-5th-century-ad-base-/gold-dinar-pgv-204

PGV 204 Weight : 7.61 Grams
Diameter : 20.38 mm

Jayratava Kidara (400 -500 AD)
AU Dinar Electrum 7,12g 19mm; MACW 473; Kidarite Successors. Kushan style king standing left; *ka* in Brahmi to left; monogram of Kidara in Brahmi to right / Abstract Ardoxsho seated facing; holding filleted investiture garland and cornucopia; *ka?* in Brahmi to left; *jayratava* in Brahmi to right.
https://www.coinarchives.com/w/lotviewer.php?LotID=5094545&AucID=5736&Lot=1788&Val=d6dfbec9f41da719e9815ecad63d0656

Pratapaditya II (401 - 499 AD)
Post-Kushan Dinar Electrum 7,10g 20mm; *Pratapaditya II*. Debased standing king facing with head to left. Crude portrayal of Goddess *Ardoksho* enthroned.
https://www.coinarchives.com/w/lotviewer.php?LotID=5094546&AucID=5736&Lot=1789&Val=8981e2965113149f131d2ff7b37c8716

Toramana II (c. 530-570 CE)
AE stater (19 mm, 6.80 g) Obverse: King standing, sacrificing at fire altar, with traces of Brahmi legend *Sri Toramana* at left along circular margin Reverse: Goddess Lakshmi seated facing, holding a long-stemmed lotus, with Brahmi legend *Jaya* at right.

Sri Pravarasena/ Pravarasena II (530-590 CE)
https://en.wikipedia.org/wiki/Sri_Pravarasena

Durlabhavardhana/ Prajnaditya (625−661/2 CE)

Durlabhaka/ Pratapaditya (662−712 CE)

Candrapida/Vajraditya (712/13−720 CE)
Zhentuoluobili of Chinese Sources
Tarapida (724 CE)

Lalitaditya Muktapida (724/725CE−760/761 CE)
Kuvalayapida
Vajraditya /Vigraha Deva (763−770 CE)

Prithivyapida I
Jayapida

Lalitapida

Samgramapida II

Cippatajayapida /. Brhaspati) (837/8-840 CE)

Ajitapida son of Tribhuvanapida

Anangipida

Utpalapida son of Ajitapida

Avanti Varman (853-888 CE)
http://www.worldofcoins.eu/forum/

Sankaravarman (c883-902 CE)
Obverse: Goddess Lakshmi seated facing, with Nagari legend *Sanka(ra)* at right Reverse: King standing sacrificing at altar, with Nagari legend **Va(rma**) at right.
http://www.worldofcoins.eu/forum/

Gopala Varman (902-904 CE)
http://www.worldofcoins.eu/forum/

Sugandha Rani (904-906 CE)
http://www.worldofcoins.eu/forum/

Partha Varman (907-923 CE)
http://www.worldofcoins.eu/forum/

Chakravarman (923-933: 935: 936-937 CE)
http://www.worldofcoins.eu/forum/

Parva Gupta (958-950 CE)

Kshema Gupta (950-958 CE)
His coin was a joint issue with his wife queen Didda.
http://www.worldofcoins.eu/forum/

Kshema Gupta and Didda Rani
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

Jasaskara
http://www.worldofcoins.eu/forum/

Abhimanyugupta (958 – 972 CE)
Obverse: Goddess Lakshmi seated facing, with Nagari legend *A* at right *Bhima(nyu)* at left. Reverse: King standing sacrificing at altar, with Nagari legend *Gupta* at right.
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

Nandi Gupta (972-973 CE)
Obverse. *Nandi Gu* Reverse *pta*.
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

Tribhubana Gupta (973-974 CE)
Obverse: Goddess Lakshmi seated facing, with Nagari legend *Tri* at right *Bhubana* at left. Reverse: King standing sacrificing at altar, with Nagari legend *Gupta* at right.

Bhima Gupta (974-979 CE)
Obverse: Goddess Lakshmi seated facing, with Nagari legend *Bhi* at right *ma* at left. Reverse: King standing sacrificing at altar, with Nagari legend *Gupta* at right

Didda Rani (979-1003 CE)
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

Sangrama Deva (1003-1028 CE)
Obverse. *Sangrama Ra-*. Reverse. *ja Deva*.
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

Ananta Deva (1028-1063 CE)
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

Kalasa Deva (1081-1089 CE)
The coin was called Paddka during this reign. Obverse. *Kalasa Ra* Reverse. *-ja Deva*.
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

Harsha Deva (1089 -1101 CE)
His gold coin was called *Utkosh*. Obverse.*Harsha Raja*. Reverse. *Deva*.
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

Uchchala Deva (1101-1111 CE)
Obverse: Goddess Lakshmi seated facing, with Nagari legend *(U)chcha* at left, *la* at right Reverse: King standing sacrificing at altar, with Nagari legend *De(va)* at right.

Sussala Deva (1112-1120 CE and 1121 – 1123 CE)
1st reign (1112-1120 AD) Obv. *Sussala.* Rev. D*eva*.

Jayasimha Deva (1123 -1155 CE)
Obv. *Sri Jaya Sinha*. Rev. *Deva*.

King Jagadeva (1199-1213 CE)
AV Stater. Toramana standing facing; *ja* to left; *ga* to right. Figure of goddess standing facing; *de[va]* to right.
https://ancient-indian-coins.blogspot.com/2018/05/hindu-kingdom-of-kashmir.html

****

شاگرد تھوما کی ٹیکسلا آمد کا معاملہ امکانات اور واقعات کی روشنی میں

مظفر احمد

Saint Thomas in Taxila, Possibilities and realities

Muzaffar Ahmad

ARTICLE INFO

***Keywords*:**
Saint Thomas
Taxila
Archaeology

ABSTRACT

There is vast material available on the relavenece of archaeological evidence of Sait Thomas' visit of Taxila during Indo Parthian reign as recorded in early Christian sources.However many details preserved in Eastern Christian literature has not been analysed yet. This paper is an attempt to reavalute and contextualise the ancient material on St. Thomas' visit to Inida with the help of neglected material and fresh archeological findings.

کلیدی الفاظ:

شاگرد توما
ٹیکسلا
آثاریات

خلاصہ: ٹیکسلا میں مقدس تھوما کی آمد کے حوالے سے ابتدائی مسیحی تحریری مواد اور آثاریاتی شہادت میں تعلق پر وافر تحقیقی مواد موجود ہے۔ تاہم کئی ایک ایسی تفاصیل جو مشرقی مسیحی لٹریچر میں بیان ہوئیں ہیں تجزیہ کاروں کی نظر میں آنے سے رہ گئی ہیں۔ مندرجہ ذیل مضمون میں اسی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مقصد یہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ کم کم نظر میں آنے والے قدیم تحریری مواد اور تازہ آثاریاتی دریافتوں کی روشنی میں اس معاملہ کو دیکھا جائے اور اسے کسی سیاق میں لانے کی کوشش کی جائے۔

پہلی صدی عیسوی کے اوائل کا ٹیکسلا اس قدیم یونانیت مائل دنیا میں مشرق کی طرف آخری میٹروپولٹن شہر تھا جس کی سیاسی قیادت اب یونانیوں کے ہاتھوں سے یا تو نکل چکی تھی یا تیزی سے نکل رہی تھی۔ ٹیکسلا یا تکشا سیلا میں یونان، روم، شام اور پارتھیا سے لے کر تبت، ختن اور چین تک بہت سی مملکتوں، ریاستوں اور سلطنتوں کے لوگ ایک دوسرے سے مل جل سکتے اور باہم تجارت اور تبادلہ خیالات کر سکتے تھے۔ انہی لوگوں میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے راہب، سادھو سنت، جوگی اور دھرم پرچارک بھی شامل تھے جن میں سے کچھ تو تکشا سیلا میں آباد تھے اور کچھ دور دراز سے مسافتیں طے کرتے یہاں پہنچتے تھے۔ ایک ایسے ہی بزرگ کا سامی نام یہوداہ توما اور یونانی نام دیدیمس جوداس تھوماس تھا جو ایک قدیم سریانی مسیحی کتاب ایکٹا تھوما (Acta Thoma) کے مطابق پہلی صدی کے ٹیکسلا میں تشریف لائے۔

توما ٹیکسلا آئے تھے یا نہیں اس پر تحقیقی رنگ میں کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر 1988ء سے لے کر 2006ء تک، پاکستان کے معروف ماہر آثارِ قدیمہ محترم ڈاکٹر سیف الرحمان ڈار نے کم از کم تین تحقیقی مضامین میں قدیم مسیحی ماخذوں، قدیم لٹریچر اور آثارِ قدیمہ کی شہادتوں کی بنیاد پر ہند پارتھی بادشاہ ہندوفر (سریانی میں جندافر یا گندافر، سنسکرت اور پراکرت میں گودوواراسا اور یونانی میں گونڈوفیریس) کے دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد تھوما (دیدیمس جوداس تھوماس) اور اپالونیوس آف تائینا اور اس کے شاگرد دامس کے ٹیکسلا میں گونڈوفارس کے دور میں آنے کا تجزیہ کیا ہے۔ 1988 میں انہوں نے جان رونی کے منعقد کردہ سمپوزیم میں Gondophares and Taxila کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ پھر 2001 میں سوہدرہ گزٹ میں Taxila Cross and Saint Thomas - Was Taxila A Centre of Missionary Activities In The First Century AD? شائع کیا اور پھر اپنی کتاب Historical Routes Through Gandhara(Pakistan) کے صفحات 171 تا 176 پر ایک بار پھر اس معاملہ کا آثاریاتی تاریخی تحقیقی تجزیہ پیش کیا۔ اگرچہ اکثر توجہ طلب امور ڈاکٹر صاحب موصوف کے تحقیق کام کے نتیجے میں سامنے آچکے ہیں تاہم

میرا خیال ہے کہ اس معاملہ کے کچھ زیادہ سامنے نہ آنے والے پہلوؤں پر میں شاید کچھ مزید روشنی ڈال سکوں۔

اس ضمن میں ملحوظ رہے کہ جو معاملات حل شدہ ہیں وہ :

۱۔ سریانی ماخذ اعمال توما میں مذکور ٹیکسلا پر قابض ہند پارتھی بادشاہ گونڈوفارس (گونڈوفیریس یا گندافر) اوّل اور اس کے بھائی جاد کا تاریخی شخصیات ہونا ہیں۔ اس بارے میں کئی ایک آثاریاتی، کتباتی اور تاریخی شواہد دستیاب ہو چکے ہیں۔

۲۔ جس معاملہ پر تکنیکی طور پر اب کوئی اعتراض موجود نہیں رہا وہ پہلی صدی عیسوی میں رومی، یونانی اور شامی سریانی افراد کا عالمی راہی جال (travel web) کے اس حصے کے دھاگوں اور دھاگیوں کے اس سلسلے پر آباد ہونا اور آمد و رفت رکھنا ہیں جو سواحل بحیرہ روم سے کشمیر اور ان ہر دو سے ارے پرے تک ممتد تھا اور جسے شاید "مشرق مغرب عالمی بری و بحری تمدنی راہ" کہنا اسے شاہراہِ ریشم کا نام دینے سے زیادہ موزوں ہے۔ ان راستوں پر اس قسم کے تحرک کے کافی شواہد آثاریاتی اور کتباتی طور پر دستیاب ہو چکے ہیں۔

اب جو معاملہ وضاحت طلب رہ گیا ہے وہ صرف توما کی آمد کا حتمی ثبوت ہے۔ یہ ثبوت دو طرح سے فراہم کیا جا سکتا ہے:

(الف) ایک تو توما اور اپالونیوس کے حالات میں سے یہ ثبوت فراہم ہو کہ یہ حالات واقعی کم از کم اپنی ابتدائی حالت کی حد تک چشم دید مشاہدات پر مبنی ہیں۔

(ب) اور دوسرے کسی آثاریاتی یا تحریری ثبوت سے یہ معاملہ حل ہو جس کا کہ صرف انتظار ہی کیا جا سکتا ہے۔

البتہ جب تک کوئی حتمی ثبوت توما کے اس سفر کے حق یا تردید میں دستیاب نہیں ہوتا موجود آثاریاتی تاریخی شواہد کے تنقیدی تجزیے سے حاصل شدہ نتائج سے تھوما کی ٹیکسلا آمد کے حالات اور اپالونیوس کے حالات کا موازنہ کر کے ممکنہ حد تک بہترین نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

ان واقعات کے ظہور کا زمانہ

حیاتِ اپالونیوس آف تائینا (Tà ἐς τὸν Τυανέα Ἀπολλώνιον) دراصل Lucius Flavius Philostratus کی تصنیف ہے جس کا زمانہ 127 سے 250 عیسوی کے درمیان ہے۔ اور مصنف کے بقول اس کا ممدوح اپالونیوس 3 عیسوی سے 97 عیسوی تک زندہ رہا۔ آٹھ جلدوں کی اس کتاب میں ہندوستان کی سیاحت کا احوال اس کے شاگرد دامس کی روایت (Memoirs of Damis) سے بیان ہوا ہے۔

اپالونیوس کے سفر نامے کے متعلق سکالرز کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ دراصل یہ کسی اور سیاح کی سفری ڈائری تھی جسے مصنف نے ملکہ جولیا ڈومنا کو محظوظ کرنے کی خاطر اپالونیوس اور دامس کے کھاتے میں ڈال دیا۔ تیسری چوتھی صدی کے ادانا شہر کے کتبہ میں اپالونیوس کے ذکر کی وجہ سے اپالونیوس کا تاریخی شخصیت ہونا شک سے بالا ہے تاہم اس کا ہندوستان آنا بعض محققین کے نزدیک مشتبہ ہے۔ Lucian of Samosata نے بھی 180 عیسوی کے بعد اس پر تنقید کی ہے۔ قرائن اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دوسری صدی کے وسط سے رومی ایشائے کوچک اور اس کے مغرب میں مسیحیت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کو کم کرنے کے لئے اپالونیوس نامی اس شامی فلسفی راہب کی سوانح کو شاہی سرپرستی میں دوبارہ سے لکھوا کر مسیحیت کے بانیان کے مقابل پر پیش کیا گیا اور اسے مقبول کرایا گیا۔

حیاتِ اپالونیوس میں بیان کردہ واقعات کے مطابق پارتھی بادشاہ وردانیس (40 تا 47 عیسوی) نے اپالونیوس کو انڈس کے پار تھی ستراپ فرہاد (Phraotes) کے نام ایک تعارفی تحریر دی (کتاب 2 جز 17)۔ اس ستراپ نے اپالونیوس کو بتایا کہ وہ اپنی جلاوطنی کے دنوں میں دریائے بیاس کے پار مقیم رہ کر یونانی زبان کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ یہ ایک بہت اہم نکتہ ہے۔ ہند یونانی اقتدار اپنے غروب ہونے کے دنوں میں سیالکوٹ اور جموں کے مشرقی حصوں کی طرف منتقل ہوتے ہوتے بالآخر ہمالیہ کی ترائی کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرف سمٹ کر ختم ہو گیا تھا اور اگر کچھ یونانی جاننے والے بچے تھے تو وہ پہلی صدی عیسوی کے نصف اول میں چناب، راوی اور بیاس کی

بالائی وادیوں میں یونانیت کے مکمل خاتمے سے پہلے کچھ دیر جھلملائے ہوں گے۔ کچھ مسکوکاتی شہادت اس بارے میں موجود ہے تاہم فیصلہ کن نہیں ہے۔

اپالونیوس کی کتب میں ابواب 1.19 – 3.58 میں اس کی سیاحتِ ہند کا احوال درج ہے۔ سفرنامے کے ان حصوں کے مطابق منبج یعنی شام کے ہیراپولس(Hierapolis Bambyce)میں اپالونیوس کی ملاقات دامس سے ہوئی۔ جو بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ اعمال دیدیمس (تھوما) اور وقائع دامس (حیات اپالونیوس) دونوں کے واقعات 45-46 عیسوی کے لگ بھگ شروع ہوئے جن میں دامس اپنے گرو کے ساتھ مادی طور پر سفر میں تھا اور دیدیمس یہوداہ توما کے استاد انہیں راستے میں گاہے بگاہے ملتے رہتے تھے جیسا کہ اعمالِ توما کے مختلف ایڈیشنوں میں لکھا ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دامس کا کردار دراصل مسیحی بزرگ ہپولائٹس کے بیان کردہ ستر شاگردوں کی فہرست میں شامل ایک شخص دیماس کا ہے جو مسیحی ذرائع کے مطابق بعد میں بت پرست (پیگن) ہو کر بتوں کا پروہت بن گیا تھا۔ جب اپالونیوس کو ایک مقبول کردار بنانے کی غرض سے اس کی سوانح حیات لکھوائی گئی تو اسے اپالونیوس کے شاگرد، ہم سفر اور کاتب کے طور پر کتاب میں متعارف کرایا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دیماس نے مسیحیت ترک کرنے کے بعد اپالونیوس آف تائینا کی ہم سفری اختیار کی ہو اور اس کے ساتھ ہندوستان تک آیا ہو۔

توما

توما بارہ شاگردوں میں سے ایک تھے اور ابتدائی مسیحی لٹریچر میں ”جڑواں“ کہلاتے تھے۔ آپ سے انجیل توما منسوب ہے جو مکمل شکل میں مصر میں ناگ حمادی کے آثاریاتی مقام اور نامکمل اوراق کی شکل میں مصر میں دوسرے مقامات سے دستیاب ہوئی ہے۔ توما شاگرد کے سفرنامے کا آغاز یعقوب شاگرد کی سربراہی کے دور میں ہوا جب انجیل توما کے جفر ۱۲ میں بیان شدہ شاگردوں کے خدشہ کے مطابق ان کے آقا مزید ان میں موجود نہیں تھے۔

سریانی اعمال توما سے پتہ چلتا ہے کہ توما کے سفر ہند کا آغاز واقعہ صلیب کے کئی برس بعد یا تو آدیابانی (موصل و نصیبین سے اڈیسہ تک کا علاقہ) سے ہوا یا پھر اسکندریہ سے۔ لیکن صرف توما کے سفر کی ہی بات نہیں بلکہ مسیحیت کی قدیم مشرقی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اولین مسیحیوں کے ہاں صرف توما کا ہی ہندوستان کی طرف آنا نہیں مانا جاتا تھا بلکہ مختلف ماخذوں میں نصف درجن کے قریب شاگردان کے بارے میں ہندوستان آنے کا ذکر کیا گیا ہے۔کتاب Bibliothecae Orientalis Clementino Vaticanae کی تیسری جلد کے صفحات ۱ تا ۷۰ میں شاگردوں کی سیاحتوں کی مشرقی روایات جمع کی گئی ہیں۔ ان روایات کے مطابق توما نے ہند اور سند اور ان سے ملحق مشرق میں بحر الاخضر کا سفر کیا جہاں بعد میں یعقوب بن یہودا بھی ان سے آن ملے۔ یہی بات المقریزی نے بھی لکھی ہے کہ "وثار یعقوب بن حلفا الی هند و رجع الی القدس و قتل فی عاشر امشیر "(خطط المقریزیہ جلد چہارم ص379) کہ یعقوب بن حلفا ہندوستان کی طرف گئے اور پھر بیت المقدس لوٹ آئے۔ بارثلمی شاگرد کے ہند آنے کا ذکر یوسی بس نے کیا ہے۔ (یوسی بس تاریخ کلیسیاء ص94 لندن 1929) بارثلمی نے توما کے ساتھ، ادی اور ماری اور اجی کے ساتھ مل کر نصیبین اور الجزیرۃ اور موصل اور ارضِ بابل و سواد اور بلادِ عرب اور ارضِ مشرق اور نباطیہ اور اهواز و فارس میں کام کیا۔ توما اقصی المشرق یعنی مشرقِ بعید تک گئے۔ پھر ارمنیۃ الکبریٰ کی طرف چلے گئے اور وہاں جماعت قائم کر کے ہندوستان اور چین الداخلی کی طرف گئے۔ ہپوٹائلس نے لکھا کہ توما نے پارتھیوں، میدیوں، فارسیوں، ہرقانیوں، باختریوں اور مرو کے رہنے والوں کو تبلیغ کی اور Calamene نامی ایک ہندوستانی شہر میں شہید ہوئے۔

توما شاگرد کو کہاں فروخت کیا گیا

ایتھوپی مسیحی متن ’’جدلا حواریات‘‘(Wallis ۱۸۹۹)میں مقدس توما کی ہندوستان میں تبلیغ (فولیو 231ب اور آگے) کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ آقا نے توما کو ہندوستان کے لئے نامزد کیا، پطرس کو ان کے ساتھ روانہ کیا اور خود بھی ساتھ رہنے کا وعدہ کیا۔ چالیس دن کی مسافت کے بعد پطرس متھیاس اور توما ایک بڑے شہر میں پہنچے جہاں سے توما اور متھیاس دونوں کی منازل نصف نصف فاصلہ پر تھیں۔ یہاں اس شہر میں آقا ان کو ایک عالم کے روپ میں ملے۔ یہاں شاگردان نے تبلیغ کے لئے منصوبہ بندی کی۔ اسی شہر میں انہیں گونڈوفارس(king Kontaros) کا ایک افسر Arbasos

ملا اور ان جیسا ایک غلام خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس پر تینوں شاگردوں نے اسے جواب دیا کہ ہم تو تین نوکر ہیں اس کے جس کا نام یسوع مسیح ہے۔ اور جو اس شہر میں اترنے کو ہے۔ اور جب وہ آئے گا تو ہم تینوں میں سے جسے چاہے گا تمہارے ہاتھ فروخت کردے گا۔ جب یسوع مسیح آئے تو انہوں نے گونڈوفیریس کے افسر سے بات چیت کی اور توما کو تین رطل سونے کے عوض اس کے ہاتھ فروخت کر دیا اور ارباسوس کے کہنے پر اسے رسید بھی لکھ دی۔ پھر آپ نے شاگردوں سے فرمایا کہ میں ہر جگہ جہاں بھی تم جاؤ گے تم سے آگے آگے رہوں گا۔ یسوع مسیح توما کو نصائح کر کے ان سے جدا ہوئے۔ پطرس اور متھیاس اپنی اپنی راہ ہو لئے جبکہ توما ارباسوس کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے۔ انہیں پتھر کی تعمیر، نجاری اور طبابت تینوں شعبوں میں مہارت کی وجہ سے گونڈوفیریس (کونٹاروس) کے ہاں لے جانے کے لئے چنا گیا تھا (فولیو 324)۔ توما کی مزاحمت پر ارباسوس نے انہیں ان کے آقا کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی فروخت کی رسید دکھائی ۔اس زمانہ میں گونڈوفیریس یا ایتھوپی مخطوطہ کے شاہ کونٹاروس (شاہِ گندہار) کا گورنر (Lukiyanos (Vccius تھا جس کی بیوی کا نام Arsonwa (Arsenia) تھا۔

جہاں تک پطرس کے توما کے ساتھ سفر کرنے کا معاملہ ہے اس بارے میں قدیم مسیحی لٹریچر میں کچھ ذکر ملتا ہے لیکن سریانی اعمالِ توما میں اس بات کا ذکر موجود نہیں۔ آثاریاتی حوالے سے ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ پطرس کا ایک چھوٹا دستی مجسمہ جیسا کہ قدیم زمانے سے روم میں بنایا جاتا رہا ہے چارسدہ سے دستیاب ہوا تھا۔ دریافت کے معاً بعد یہ غائب کر دیا گیا اور اب کچھ معلوم نہیں کہ یہ کہاں گیا۔

"پطرس اور بارہ کے اعمال" اور "توما مباحث کی کتاب"

ایتھوپی جدلا حواریات (Wallis ۱۸۹۹) کی اس روایت کا تعلق کہ توما کو جب ان کے آقا نے وطن (گلیل یا یروشلم) سے چالیس دن کی مسافت پر ایک شہر میں گونڈوفارس کے تجارتی ایجنٹ کے سپرد کیا تو اس وقت توما کے آقا ایک عالم کے حلیے میں تھے مصر میں ناگ حمادی کی کھدائی سے برآمدہ دو قدیم قبطی میں ترجمہ شدہ مسیحی دستاویزات سے ہے۔ ان میں سے ایک "توما مجادل / مباحث" کی کتاب ہے۔ اس مختصر رسالے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب اسی سفر میں جو جدلا حواریات کے مصنف کے بقول توما کو گونڈوفارس کے ہاں بھجوانے کے لئے کیا گیا تھا لکھی گئی۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ توما مباحث کی اس کتاب کے مطابق توما اور ان کے آقا کے درمیان اس مکالمے کو متھیاس نے ایک ایسے سفر میں لکھا تھا جس میں توما اور متھیاس ہم سفر تھے۔

چارسدہ سے ملنے والا پطرس کا مجسمہ

توما مجادل کی کتاب میں توما کے آقا توما سے "بھائی توما" کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ توما سے کہتے ہیں: "اب چونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ تم میرے توام ہو اور سچے رفیق ہو تو تم اپنا تجزیہ کرو۔۔۔ چونکہ تم میرے بھائی کہلاؤ گے اس لئے یہ مناسب نہیں کہ تم اپنے آپ سے لاعلم رہو"۔ اس کے جواب میں توما "سیدنا" سے کہتے ہیں کہ اسی سبب سے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری رہنمائی کریں کہ میں آپ کے رفع سے پہلے پہلے آپ سے کیا کیا دریافت کروں۔

دوسری کتاب "پطرس اور بارہ کے اعمال" ہے جس کا تعلق مقدس توما کو گونڈوفارس کے تجارتی ایجنٹ کے سپرد کئے جانے والے سفر سے ہے۔ اس کتاب میں توما کے آقا انہیں ایک دور دراز کے شہر میں ملتے ہیں جو ایک ساحلی جزیرہ یا جزیرہ نما آبادی ہے۔ وہ ایک کتاب تھامے ہوئے اور حلیہ بدلے ہوئے ہیں یعنی ایک عالم کے حلیے میں ہیں۔ وہ انہیں اس شہر سے نکل کر ایک اور دور کے شہر آنے کا کہتے ہیں جو ایک طویل شاہراہ کے دوسرے

سرے پر واقع ہے۔ اس شہر میں "سیدنا" انہیں ایک طبیب کے روپ میں ملتے ہیں اور انہیں طبابت کا ہنر اپنانے کی تعلیم دیتے ہیں۔ جدلا حواریات میں ہی یہ روایت بھی درج ہے کہ یعقوب ابن زبدی کو پطرس نے Thenoatic یعنی ہندوستان میں تبلیغ کے لئے بھیجا اور خود ہندوستان تک یعقوب کے ساتھ آئے۔ راستے میں انہیں سیدنا ملے اور ان دونوں کو نصائح کیں۔ ان دونوں نے اپنے اس سفر کا مقصد یہ بیان کیا کہ تا کہ ہم بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو جو بیرون میں پراگندہ ہیں دوبارہ جمع کریں اور اس کا عظیم اجر ہمیں نصیب ہو۔ ہندوستان میں انہوں نے ایک شہر کے لوگوں کو شہر کے بڑے دریا سے بپتسمہ دیا، ایک معبد تعمیر کیا اور لوگوں کا ایمان مضبوط ہونے تک وہاں مقیم رہے۔ یعقوب بن زبدی نے انہیں کتابِ شریعت اور کتابِ انبیاء کی تعلیم دی۔ اسے ترجمہ کر کے انہیں دیا۔ کئی دن ان لوگوں کے ساتھ رہے اور جب ان کا ایمان مضبوط ہو گیا تو ان پر ایک بشپ مقرر کیا۔ اس کے بعد پطرس اور یعقوب وہاں سے روانہ ہوئے۔ متی نے ہندوستان کا قصد کیا اور وہاں تبلیغ کی اور بعض اوقات توما اور ادی اور ماری کے ساتھ مل کر مشرق کے بعض علاقوں میں کام کرتے رہے اور نصیبین و موصل میں بھی گئے لیکن وہاں سے جلد لوٹ گئے۔ یہوداہ ابن یعقوب سوریہ اور الجزیرۃ میں پیغام پہنچانے کے بعد انطرسوس اور لاذقیہ، تدمر، الرقہ، قرقیسیہ سے الشیمن (یمن) گئے پھر بعض مشرق کے علاقوں میں جانے کے بعد توما کے پاس ہندوستان آ گئے اور ایک عرصہ تک ان کے ساتھ رہے۔ پھر وطن لوٹے اور بیروطوس میں دفن ہوئے۔ ادی، ماری اور توما اور ان کے تلامذہ نے مل کر دریائے فرات کے پار مشرق میں مطلع شمس تک تبلیغ کا کام کیا۔

عربی کتاب بلوہر و بوذاسف کا تنقیدی مطالعہ بھی اعمالِ توما اور کتاب بلوہر و یوزاسف میں کئی ایک قریبی مماثلتیں دکھاتا ہے۔ مثلاً سریانی اعمالِ توما میں جو گیت توما نے ہند کے قید خانہ میں گایا وہ بھی ایک مختصر شکل میں کتاب بلوہر و یوزاسف کے بمبئی متن میں شامل ہے۔ اسی طرح مصر میں ناگ حمادی سے کھدائی میں برامد ہونے والی دستاویز پطرس اور بارہ کے اعمال میں لتھر گوئل کا کردار کتاب بلوہر و بوذاسف کے بلوہر کا ہی ہے۔ محتاط تنقیدی مطالعہ بتاتا ہے کہ کتابِ بلوہر و یوزاسف جو ایک تبلیغی ناول ہے اس کا پلاٹ قدیم عبرانی مسیحی جماعت کے تعلیمی ناول خطباتِ کلیمنٹ سے بالکل مماثل ہے اور دونوں میں ایک اقتباس مشترک بھی ہے۔

گونڈوفیریس

سریانی کتاب النحل میں زروندادبن ارتابانوس اور ہرمزداد ابن گندافر کا ذکر بھی اس وفد کے شاملین کے طور پر کیا گیا ہے جو بیت اللحم گیا تھا (کتاب النحل ۱۸۸۶ ص ۸۶)۔ یہ ہرمزداد اعمال توما کا مزدا (یونانی اور لاطینی ماخذوں میں "Misdeos" یا "Misdeus") ہی ہے۔ جس نے اڈیسہ کی روایات کے مطابق توما کی باقیات واپس اڈیسہ بھجوائیں (ویب سائٹ Mosul Eye)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایتھوپیا ہی سے دستیاب ہونے والے قصہ بلوہر و بوذاسف کے قدیم نسخے میں توما کو پیش آنے والے واقعات کے کئی دہائیوں بعد توما کے عہد کے ہندی بادشاہ کی اولاد میں ایک اور شخص اواداگاس کا ذکر ہے جو اواداگا سادوم یعنی ابداگاسیس دوم سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔

Herzfeld کے بقول Phraotes گونڈوفیریس کے سکوں پر تحریر apratihata ہی ہے (1932:101) ۔ لیکن اس کی تُک کم ہی بنتی ہے۔ اغلب یہی ہے کہ یہ دراصل پارتھی کا نام فرہاد ہی ہے۔ گونڈوفارس یا گونڈوفیریس کے ایرانی تلفظ vindafarna اور Gundaparnah وغیرہ ہیں۔ سریانی تحریرات میں اسے Gudnaphar یا Gundapar لکھا گیا ہے۔ یہ معزز پارتھی سورین خانوادے کا فرد تھا اور 129 ق م میں اس کے اجداد نے ساکاؤں کو سکستان سے نکال باہر کیا تھا اور آراکوشیا اور پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس کا autokrator کا لقب اختیار کرنا بتاتا ہے کہ وہ پارتھی سلطنت کی طرف سے یا از خود خود مختاری حاصل کر چکا تھا۔ تھوما کی آمد کے وقت وہ کابل، گندھارا، پنجاب، سندھ، آراکوشیا اور درنگیانا پر حکومت کر رہا تھا۔

آر سی سینئر نے Gondophares-Sases یعنی گونڈوفیریس چہارم کو تھوما کا میزبان قرار دیا ہے۔ ۱۸۳۴ء میں اس کے سکے برآمد ہوئے تھے جن میں سے ۳۳ برٹش میوزیم اور ۲۴ کلکتہ میوزیم میں ہیں۔ تخت بھائی سے گونڈوفیریس کا کتبہ بھی برآمد ہوا جو اب لاہور میوزیم میں موجود ہے۔ اس کا ایک چاندی کا سکہ جس پر اس کا خطاب Hyndopharres اور لقب سام

درج ہے (Bivar 1981:141-50)۔ یہ پہلا گونڈوفارس تھا اس کے بعد یہ لقب اس خاندان میں عام ہو گیا (**MacDowall 1965: 137-48**)۔

اعمالِ توما

اعمالِ توما اپنی موجودہ اشکال میں ایک باطنی (Gnostic) تحریر ہے جو توما کی تبلیغی مساعی کی کسی قدیم رپورٹ میں تبدیلیاں کر کے تیار کی گئی ہے۔ اس کی یونانی شکل 200 سے 250 عیسوی کے درمیان میں کہیں ایڈٹ کی گئی۔ اس دستاویز میں ٹیکسلا کے بادشاہ گونڈوفیریس کے تجارتی نمائندہ حبان (جسے ایتھوپی جدلا حواریات میں ارباسوس لکھا گیا ہے) کے بحیرہ روم کے کسی ساحلی شہر میں توما سے ملاقات کا ذکر ہے جہاں توما کے "آقا" نے اسے یعنی دیدیمس جوداس توماس کو ایک لکڑی اور پتھر کی تعمیرات کے ایک کے طور پر حبان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دستاویز کے مطابق انہوں نے یہ قدم اس لئے اٹھایا تا کہ ہندوستان جا کر تبلیغ کرنے میں تامل کے شکار شاگرد توما کو ہر صورت ہندوستان بھیجا جا سکے۔

****

کتابیات

Bivar, A.D.H.,"Gondophares and the *Shāhnāma*," *Iranica Antiqua* 16: *In Memoriam Roman Ghirshman* II, 1981, pp. 141-50.

The Book of the Bee. Ed. And Trans. Willis Budge. Oxford. The Clarendon Press. 1886.

Dar, *S. R.*, "*Gondophares and Taxila*", in J. *Rooney* (*ed.*), *St* Thomas and *Taxila* (PCHS 1), Rawalpindi, 1988, pp. 16 - 30.

Dar, *S. R.*, Taxila Cross and Saint Thomas - Was Taxila A Centre of Missionary Activities In The First Century AD?

Dar, *S. R.*, 'Taxila Cross and Saint Thomas - Was Taxila A Centre of Activities In The First Century AD?" Sodhra Gazette, Number 16, January 2001, 1-16.

Dar, *S. R.*, Historical Routes Through Gandhara(Pakistan) 2006.Feroz sons

MacDowall, D.W., "The Dynasty of the Later Indo-Parthians," *Numismatic Chronicle*, 7th series, 5, 1965, pp. 137-48

Robert C. Senior, Indo-Scythian Coins and History, Volume 4: Supplement, London, Chameleon Press, (2006).

Roper, Marilyn Keyes, *The Church of the East: Parallel Development of Christianity,*

Wallis, B. E. A. (1899). *The contendings of the apostles.* H. Frowde. (جدلا حواریات)

https://www.academia.edu/28094671/THE_CHURCH_OF_THE_EAST_PARALLEL_DEVELOPMENT_OF_CHRISTIANITY.

Mosul Eye, https://mosul-eye.org/2019/01/09/the-oldest-church-of-saint-thomas-in-old-mosul-

خطط المقریزیہ جلد چہارم ص379

Concept Proposal for Cholistan Heritage Museum at Islamia University Bahawalpur

Mohammad Rafique Mughal(T.I)

جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں چولستانی آثاریاتی ورثہ کے عجائب گھر کے قیام کی تصوراتی تجویز

محمد رفیق مغل (تمغہ امتیاز) *

ARTICLE INFO **ABSTRACT**

Keywords:
Ancient Cholistan
Cultural heritage
Archaeology
Museology
History

The Islamia University Bahawalpur plans to establish a new museum to display cultural richness of Punjab centered on Cholistan where archaeological discoveries represent a very long sequence of the Harappan or Indus Civilization from its origin, to climax and gradual decline followed by the Islamic and colonial periods until the emergence of Pakistan. It will contain several galleries representing significant cultural-historical segments supported with laboratories and research facilities affiliated with the university's science laboratories and with adequate number of qualified educators and researchers. The proposal was originally written in 2019 but has since been revised and updated.

کلیدی الفاظ:
قدیم چولستان
ثقافتی ورثہ
آثاریات
میوزیولوجی
تاریخ

خلاصہ: جامعہ اسلامیہ بہاولپور نے چولستان کے حوالے سے جہاں آثاریاتی دریافتیں ہڑپائی یا وادئ سندھ کی تہذیب کے ایک نہایت طویل دور کو پیش کرتی ہیں پنجاب کی ثقافتی دولت کی نمائش کے لئے ایک نیا عجائب گھر بنانے کا منصوبہ بنایاہے۔ یہ دور ہڑپائی تہذیب کے دور آغاز، دور عروج اور بتدریج زوال کے ادوار اور اس کے بعد اسلامی اور نوآبادیاتی ادوار تک ممتد ہے جس کے بعد پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس عجائب گھر میں کئی گیلریاں شامل ہوں گی جو نمایاں اور اہم ثقافتی ۔تاریخی حصوں کی نمائش کے لئے مختص ہوں گی۔ ان کے ساتھ ساتھ تجربہ گاہیں بھی قائم کی جائیں گی اور معقول تعداد میں مہارت کے حامل معلمین اور محققین بھی مہیا کئے جائیں گے۔ یہ پروپوسل دراصل ۲۰۱۹ء میں تحریر کیا گیا تھا اور تب سے اب تک اس پر نظرثانی اور ترمیم و اضافہ کا کام جاری رہاہے۔

*سابق ڈائریکٹر جنرل ڈیپارٹمنٹ آف آرکیالوجی اینڈ میوزیمز پاکستان

Cholistan: A Cultural-Historical Perspective

The Islamia University Bahawalpur (IUB) is located in the heartland of Pakistan in southern Punjab, a region which historically and culturally, played very important role in the emergence and development of early civilizations of Pakistan such as the Indus or Harappan Civilization. The Cholistan desert (called *Rohi*) in particular became famous as cultural treasure land of Pakistan ever since the discovery of more than four hundred ancient sites of the Indus Valley Civilization in 1970's. A continuous developmental sequence of the Indus Civilization dating from the fourth to second millennia BCE was revealed, representing the origins, maturity, climax and eventual decline of this remarkable civilization. A new cultural horizon relating to the beginning and earliest stage of the Indus Civilization was recognized all along the ancient course of Hakra River and defined as the Hakra Culture. It added at least five hundred years to the early history of the Indus Civilization in Cholistan. A third urban centre of the Indus Civilization called Ganweriwala, measuring more than 80 hectares in size, was discovered 17 miles south of Derawar Fort in Cholistan. It is located between Mohenjo-daro and Harappa at almost equal

distance from the two Harappan cities. The results of explorations were astounding because of their immensely revolutionary contents which were briefly highlighted in the book on Cholistan (Mughal 1997).

Subsequently, in the early historical era, the Hindu-Buddhist cultures including Jainism flourished in southern Punjab as documented at Sui Vihar[1] (Bahawalpur), Multan and Dera Ghazi Khan. Such diverse and fascinating historical traditions continued to flourish even after the advent of Islam about seventh century CE which led to the emergence of Islamic religious and mystic movements in Pakistan and South Asia and even beyond. The surviving secular and religious monuments of various historical periods and habitation sites which are now found scattered throughout southern Punjab, bear witness to the past history, cultural traditions and changing social, economic and political environments through time. Such buried cities and towns are now marked by mounds called *Tibbas* or *Thers* and are of great historical and cultural importance because of their buried contents some of which need to be excavated. Moreover, hundreds of monuments of great beauty, aesthetic value and decorative details are located in southern Punjab for example, at Uch Sharif, Dera Ghazi Khan and Multan.[2] Stylistically, these monuments have links with architectural traditions of Central Asia[3] as if inspired from that region in decorative details at least.

Cholistan is also studded with majestic forts of the Mediaeval period mostly all along the eastern (Indian) border. The forts are built of mud and burnt bricks and strengthened with imposing bastions that have withstood the ravages of time. The surviving forts stand today like battleships at anchor in the sea of sand.[4] The later history of the Abbasi rulers of erstwhile Bahawalpur State is represented by several palaces (*Mahals*) which reflect mingling of oriental and colonial architectural traditions. It was felt that a new museum was needed to encompass all historical and cultural landmarks of Bahawalpur region from the beginning of history circa 4000 BCE to the creation of Pakistan in 1947. The existing Bahawalpur Museum, organized by Dr. S. R. Dar is rich in contents but needs expansion now. The proposed new museum is expected to develop as a great research centre of various disciplines like other major museums of the world. The idea emerged from discussions following an invited lecture on the heritage of Cholistan in 2019 and presented its outline later.[5]

Multidisciplinary and Collaborative Research Perspectives

When archaeological discoveries of 1970's revealed a long and continuous story of the Indus or Harappan Civilization in Cholistan that flourished between 4000 and 1200 BCE, archaeologists reconstructed their locational patterns, functional articulation and industrial activities at various sites. The artifacts of stone, metal, shell, ivory, terracotta and pottery and a variety of other materials were collected and interpreted archeologically. Still, many aspects of human civilization in Cholistan remained unknown because of lack of vital data on other aspects of human life and culture which the archaeologists could not retrieve from ancient sites. For example, information on the physical types of population, male- female ratio, average height, mortality, diseases, foods and racial characteristics of populations which are studied by the physical anthropologists is still lacking. Furthermore, archeologists cannot reconstruct ancient environment such as climate, rainfall, water resources, vegetation cover because such studies are done by the paleo-environmentalists, botanists, geographers and sediments specialists. Moreover, identification of foods and their varieties such as wheat, barley and other species and vegetables consumed by the human and animal populations have yet to be retrieved and identified by the subject specialists. For any reconstruction of ancient life, information on animal population such as the cattle, goats, sheep and other fauna present in ancient contexts, the zoologists alone can identify and provide

relationships between the animal and human populations existing in ancient times. Various kinds of stone implements such as blades of stone and pestles for household use, beads for ornaments and other stones used in ancient times are identified and studied by the geologists to determine sources of raw materials. The metal objects found in cultural contexts and in the furnaces during archaeological excavations require chemical analyses to determine composition of metals, sources of their origin and for comparison with those found at other sites. In brief, archaeologists can provide information on cultural contexts of material remains but their analysis and interpretation depends on technical studies done by the specialists in their respective fields to reconstruct past life in context with other features. Therefore, close collaboration and cooperation of many specialists of inter-related disciplines is considered absolutely essential.

Archaeological surveys and studies have indicated that since about 4th millennium BCE or earlier, the nomadic way of life existed in the desert along with those of settled people. The nomads effectively utilized a different ecological niche to raise their cattle, goats, sheep and other animals. Thus, the nomadic populations in Cholistan have survived since the beginning of history, maintaining their own life styles and social organization but at the same time, keeping symbiotic relationships with the settled populations for exchange of finished products with their cattle, goats and sheep. It is therefore, essential to study and document their cyclical movements in the desert centered on the *tobas* (water holes) and the nature of such relationships with the settled populations maintained since centuries. The cultural anthropologists and sociologists need to study social organization of the nomads and document their life cycle, traditions, language and traditional arts.

To address such questions, it was considered essential to collect and study various kinds of data scientifically on other aspects of cultural mosaic of Cholistan. A *Multidisciplinary and Collaborative Heritage Research Project in Bahawalpur Region* was prepared to bring together specialists, experts and senior students in social and scientific fields to focus on Cholistan to document, investigate and interpret all aspects of human culture in context with environment from the beginning of history to the present times. The project received full support of the Directorate General of Archaeology, Government of the Punjab. Currently, two major institutions of Bahawalpur region namely, Islamia University Bahawalpur and Khawaja Fareed University of Engineering and Information Technology, Rahim Yar Khan are on board for conducting and promoting academic research that will further strengthen mutual cooperation among the faculty and students of various disciplines aiming at exploring and understanding past life and fascinating culture of the people of Cholistan. The project also envisages creation of *Cholistan Heritage Museum* to be located at 96-year old campus of Islamia University Bahawalpur.

Objectives of the Cholistan Heritage Museum

(i) To project and preserve fascinating history and cultural heritage of the people of southern Punjab particularly of Cholistan, their traditions, indigenous arts and crafts, folklore and literature, all of which constitute an integral component of history and civilization of Pakistan. Specific galleries will be created to focus on specific timelines of civilizational processes with regional and national perspectives.

(ii) To be a heritage research and training institution of distinction housing analytical laboratories for study of monuments and their building materials, all categories of antiquities, human and animal remains, ancient flora and fauna, soils and sediments and carbon dating.

(iii) To create database of ancient human and animal populations, monuments, sites and antiquities documented in the field or acquired through purchases, gifts or on loan and to make them accessible to the researchers.

(iv) To create and manage Museum Educational Service equipped with mobile museum service to benefit schools, colleges students and rural communities.

(v) To promote tourism in Southern Punjab and beyond.

(vi) To establish linkages with heritage institutions of Pakistan.

Contents of the Museum Galleries

In order to illustrate a comprehensive picture of Southern Punjab in the context of Pakistan, the following Galleries are proposed to be created in the beginning to which more will be added as and when appropriate:

- Prehistoric Cultures and the Indus /Harappan Civilization
- Islamic and Medieval History and Arts
- Buddhist, Brahmanical and Jain History and Arts
- Sikhs and the British History and Arts
- Cholistan and Rural Landscapes
- Folk Arts and Traditions
- *Khawaja Ghulam Fareed Gallery* of Religious and Spiritual Heritage
  (Arabic, Persian, Urdu, Sindhi and Saraiki /Punjabi manuscripts)
- *The Quaid-i-Azam Gallery* of Pakistan Movement
- *Friends of Museum Gallery* of donated or loaned artifacts
- Children s' Gallery (integral to Museum Educational Service)
- Reference Library of books, photo archives and videos

Museum Management Committees

To devise policies, rules, procedures and for implementation of heritage related programmes, the following committees are proposed to be constituted.

1. *Cholistan Heritage Advisory Committee*

   It will be the most important committee making decisions on specific matters. It will include at least two professionals/ experts in the subject and two non-professional members of the public.

2. *Cholistan Museum Acquisition Committee*

   Consisting of specialists/scholars in various subjects and oriental languages to assess all categories of artifacts and works of art, manuscripts, coins and other relics offered to the Museum as gift or otherwise .

3. *Cholistan Museum Education and Exhibition Committee*

   It will manage educational activities in collaboration with tourism, school/ college educators and museum staff.

4. *Cholistan Heritage Trust Fund*

   A non-profit Trust will be constituted and registered under the Societies Act/ Social Welfare/ Trust Act as applicable. The Central Board of Revenue (CBR) will be requested to grant tax exemption on all amounts donated to the Cholistan Heritage Trust Fund.

Principal Research Wings of the Museum

The museum will be structured on several specific wings such as anthropology, archaeology, conservation, biological, natural and material sciences in addition to projecting cultural heritage of Cholistan in all respects through time by the creation of several galleries focusing on specific themes. Each wing will be staffed with qualified scholars and researchers.

The details of administrative structure of the museum and categories of staff of various ranks are not relevant in the present context.

Therefore, the core components and research areas are listed:

Anthropology

Research Areas:

- Animal and Human Remains
- Cultural Landscapes
- Traditional Arts and Folk Heritage
- Spiritual and Literary Heritage
- Intangible Heritage

Archaeology

Research Areas:

- Geomorphology
- Environmental Archaeology
- Surveys and excavations of sites and documentation of all kinds of data
- Preparation and publication of scientific reports
- Documentation of monuments by photography and measured drawings
- Cataloguing of moveable antiquities
  (The Laboratories of IUB's Departments of Geography, Geology, Botany, zoology, Physics, Chemistry, Environment and others will be linked with the Museum for research)

Conservation of Monuments and Antiquities

Research Areas:

- Building materials analysis
- Chemical analysis and treatment of antiquities
- Analysis of vegetation remains found at ancient sites
- Measured drawings, imaging and photogrammetry of monuments
- Inventories of "Protected" and other monuments and sites

The Cholistan Heritage Museum is visualized not as a traditional museum focusing only on the cultural heritage and historical aspects of Bahawalpur region. In fact, it will be geared towards pursuing original research in all scientific, social and historical fields relevant to southern Punjab in particular but even beyond to other areas of Pakistan. All existing research laboratories of various sciences of Islamia University Bahawalpur and participating universities will be linked with the Cholistan Heritage Museum. As such, no new buildings or additional staff will be required. The ultimate goal is to make it an innovative research institution something like but different from the world famous museums such as the British Museum (UK) and the Smithsonian (USA).

An office of Cholistan Heritage Museum has been created if not established as yet at old campus of Islamia University Bahawalpur. A multidimensional, multi-disciplinary and collaborative team for research is expected to commence field research soon.

Endnotes

1. Briefly published in *Bahawalpur State Gazetteer* (1904), p. 384 but extensively reported by Farzand Masih (n.d.) with results of excavations and various readings of the inscription.

2. Dr. Ahmad Nabi Khan, an eminent historian of Islamic architecture of South Asia and Epigraphist, gives detailed description of architecture of Uchh Sharif

3. (1980) with comparative analysis of pre-Mughal style of architecture and its continuity in southern Punjab (1990). See also Mughal (1997) for monuments at Uchh Sharif, pp.113-122, Shahab (1967) and Ghauri (1999).

4. Dr. M. Abdullah Chughatai (1960) persistently argued for Central Asian

influences on pre-Mughal architecture of Pakistan.

5. Mughal (1997), pp. 125-138; *Bahawalpur State Gazetteer* (1904), pp.352-385 and Zamir (2007). The forts of Bahawalpur have been described also in other works in Urdu and English.

5. Recently, Dr. Khalil Ahmad, Assistant Professor prepared PC-I for establishing a"Cholistan Heritage Research Centre" with details of research and administrative staff.

Bibliography

Bahawalpur State with Maps. Punjab State Gazetteers, vol. XXXVI (1904).
Lahore: The Civil and Military Gazette Press.
(Chapter IV: Forts)

Chughatai, Muhammad Abdullah ((1960)
The sources of the pre-Mughal architecture, Karachi: *Journal of Pakistan Historical Society*, No. 8.

Dar, Saifur Rahman (1983)
Brief Guide to the Bahawalpur Museum. Bahawalpur: Curator Bahawalpur Museum.

Ghauri, Zubair Shafi (1999)
(in Urdu) *Uchh Sharif: Tarikh,Saqafat, Aasaar-e-Qadamat wa Azmat.* Lahore: Azaad Enterprise.

Khan, Ahmad Nabi (1980)
Uchchh: History and Architecture. Islamabad: National Institute of Historical and Cultural Research.

Khan, Ahmad Nabi (1990)
Islamic Architecture of Pakistan: An Analytical Exposition. Volume 1. Islamabad: National Hijra Council.
(pp. 47-70; 82-91; and 119,137-164).

Masih, Farzand (n.d)
Excavations at Sui Vihar and Archaeological Reconnaissance of Southern Punjab, *Research Report.* Lahore: Department of Archaeology, University of the Punjab: 1-70.

Mughal, Mohammad Rafique (1997)
Ancient Cholistan: Archaeology and Architecture: Islamabad, Lahore, Karachi: Ferozsons (Pvt). Limited.
(Uchh Sharif: 113-122 – Forts: 125-138)

Shahab, Masood Hasan (1967)
(in Urdu) *Khita-e-Pak Uchh*. Bahawalpur: Urdu Academy.

Zamir, Major General Shujaat (2007)
Sights in the Sands of Cholistan: Bahawalpur's History and Architecture. Karachi: Oxford University Press.

Acknowledgements

The author is thankful to Zubair Rabbani, Curator of Bahawalpur Museum and Bashir A. Bhatti of Lahore Museum for providing information on some bibliographical references.

Professor Ahmad Hasan Dani, Archaeologist, Anthropologist, Historian and Epigraphist Par Excellence

Dr Saifur Rahman Dar (T.I)

ڈاکٹر احمد حسن دانی؛ ماہر آثاریات، عالم بشریات، مؤرخ اور بہترین ماہر کتبات

ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار (تمغہ امتیاز)*

ARTICLE INFO **ABSTRACT**

***Keywords**:*
Dr. Ahmad Hasan Dani
Pakistan
Archaeology

The present essay is actually a biographical note about the life and achievements of late lamented National Professor Dr. Ahmad Hassan Dani who departed from us on 26th January 2009. This note has been written by one who has been Dani's Camp follower for almost 47 years. Apart from some casual references to his family background, his siblings and author's personal reminiscences about Professor Dani, the narrative has been confined, in the main, to present Dr. Dani within an aura of his professional life and the achievements made as an administrative, teacher, researchers, writer, a speaker and the author, editor, explorer, excavator and great organizers of cultural events, etc. Dr. Dani has been seen and described here within a contemporary scenario in which he appears to come out head and shoulders above most of his contemporaries especially after Sir Alexander Cunningham and Sir John Hubert Marshall. Among his contemporaries, the only other archaeologist that came be placed closer to him is Dr. F. A. Khan although the contributions and achievements of the two are in two different directions - whereas one (DR. Khan) will be remembered as a the builder of the Department of Archaeology and Museums in Pakistan . The other (Dr. Dani) will be remembered as the greatest teacher and promoter of Pakistan archaeology, both at national and international levels.
Limiting itself to professional side of Dr, Dani's career the present paper divides his career into four phases, including the one that appertains to the post-retirement period of his life (1980-2009). This phase of his life was spent in a specific geographic region of Pakistan but in each region and phase his contribution stands out distinct and different from others but in each case his contribution was outstanding both in quality and quantity. During each phase his contribution was pointed towards the specific cultural and historical potentials of the region where g he was the working.

*Former Director General Department of Archaeology Punjab

Introduction

It is almost 13 years when Professor Emeritus Dr. Ahmad Hasan Dani parted from us permanently. On account of his services rendered in the field of archaeology and its related disciplines - pre- and proto-history, historical architecture, anthropology, numismatic, epigraphy, etc. of South Asia, in general, and Pakistan in particular, carved a niche for him that still remains unoccupied. And keeping in view the present state of neglect which this subject is being met out at the hands of the Government - both at national and provincial levels - there is very little likelihood to see in near future a genius of Dani's stature to rise and occupy the podium of honour left vacant by him in 2009.

Dani is remembered for the life he has led - exemplary, brilliant, active, full of enthusiasm and always non-accusative. His achievements are larger than those of his contemporaries. He was never secretive about himself or his family. But, still most of his colleagues and contemporaries know not much about him -

particularly, about the formative period spent in the Hindu University Benares and the way it affected his carrier of an archaeologist and how did the initial years he served in the Archaeological Survey of India moulded him for taking the future duties that awaited for him in Pakistan[1]. A little we know that how and how much he suffered, both personally and professionally, at the hands of his own colleagues [2].

Despite all these heart burning events which haunted Dani for almost two and a half decades after Independence in 1947, Dani always remained friendly, humble, resolute, and hard working. He always respected his colleagues and always remained accessible to his students and researchers. Dani was capable of winning friends easily - local or foreigner alike. Although Government of Pakistan, including HEC honoured him well in his life time for his services[3], but, the universities which he served with sincerity and through hard work remained un-nerved to allow him to rise beyond the post of Dean of Faculty - an administrative post.

Family background, upbringing and early education

Dr. Ahmad Hasan Dani was born on 20th June, 1920 in a village called Basna in Chhattees Garh, Phuljar State, a fief in Madhiya Pradesh (Central Province) of India in a Kashmiri family of shawl merchants[4]. He was one of the eleven children of his father - three brothers and eight sisters[5]. Among his sisters five got married, two died about the seventh sisters Anis Dani does not speak perhaps inadvertently[6] The family had arrived there after a long sojourn from Srinagar via Sialkot, Amritsar, and Kolkata. They had to leave their hearths and homes when hard times fell on Kashmir particularly after it was handed over to Maharaja Gulab Singh. For his early education, the boy named Ahmad Hassan was sent to Amritsar where the major lot of his family was permanently settled. Here, he was admitted into a *madrassa* to learn Arabic, Persian and Urdu[7]. After primary education, the boy was taken back to Basna, his birth place, for more regular education in the nearest cities of Raipur and Nagpur. Here, circumstances obliged him to learn Sanskrit, Hindi and Urria and still later Marathi and Gujrati as well. This early exposure to so many classical languages of the Subcontinent induced him to take up study of

---

[1] Fortunately, Dani has left behind him his autobiography in Urdu (see: Dani 2011) - hereafter referred to as *Dani Kahani* . Important as it is, this autobiography, at best, is brief and at places sketchy. For example he talk a lot about his ancestors and sufficiently about his cousin-wife but very little about his own children. It appears that the last part of his autobiography was written in great haste and his declining health did not give him enough time to write about his children at some length.

[2] In his posthumously published autobiography, Dani did hint upon this unworthy treatment of him which he met at the hands of his own friends and colleagues but he never disclosed their names (***Dani ki Kahani*** , p.153). For example, he knew who among his colleagues hatched a conspiracy against his posting in West Pakistan, but he was determined not to disclose their names. Similarly, he attributes "jealousy of some of his colleagues" as the reason for his leaving, his cherished post in Peshawar University, but here too he does not blame anyone names (***Dani ki Kahani***,*.p. 178).*

[3] He was awarded **Sitar-i-Imtiaz, Hilal-i-Imtiaz, Ezaz-i-Kamal, Professor Emeritus** and last of all **National Professor** .(See: Khan 2009, p. 263; **Award List** for Ahmad Hasan Dani in: In Ancient Pakistan, Number XX, 2009, p. 263 and website. Retrieved on 3rd April, 2020.

[4] Actually, the family title "Dani" does not stand for a Kashmiri caste. Instead, it is a title confirmed on his family by the Government back in the 19th century on account of their charitable activities. Caste-wise, from his father's side Dr. Dani a **"Wyne"** whereas his mother hailed from **"Dar"** clan of Kashmiri origin (***Dani, Dani ki Kahani****, p. 29 and 32)*

[5] *Dani ki Kahani, p 34.* ***Dr. Anis Dani, on the other hand has stated that there were in all ten children of his grandfather - three sons and seven sisters.(Dani 1991pp.5-6. Perhaps he has not counted the one girl who, ,as Dani writes, died a few days after her birth. One of his younger sister was still unmarried when Pakistan came into being. One of the reasons as to why Dani wanted to get himself transferred to West Pakistan was to be able to get her married which was more easy to do in West Pakistan than in East Pakistan.***

[7] Strangely enough he and his wife started learning Punjabi during their stay in Dacca (1950-1961).(M. Mamoon 1991, p. 56.

Sanskrit for his graduation from Nagpur University. This helped him in getting admission for his Master Degree in the Hindu University, Benares - now Varanasi where he was the first Muslim student to be admitted in the Faculty of Arts since its foundation some 26 years back. In Benares University his teacher was Prof. A. S. Altekar. Despite several difficulties, which he faced there as a Muslim[8], he over-shined all others and won gold medal for standing first class first in his final examinations in 1942. As per University rules, all gold medalists were offered a teaching post in the University. Instead, he was awarded only J. K. Fellowship @ Rs. 80/- per month for conducting research on ancient Hindu society. However, he was fortunate to get a scholarship of Rs.250/- per month from the Nawab of Hyderabad Deccan on the recommendation of Dr. Radha Krishnan, the then V.C. of his University. This raised his monthly income more than the pay of a regular lecturer in the same university.

Before we discuss his active life as a government officer, let us touch, briefly through, another least known aspect of his life i.e. politics. Dani that I know appears never to have taken part in politics. But now his son Dr. Anis Dani has revealed that his father was a political activist during his college days at Nagpur when he worked with K. M. Ashraf and Comrade Dange of the Communists Part of India. But this affected badly his academic career . By the time he arrive in Hindu University, Benares, his flame of his romance with politics had already smothered[9].

Dani joins excavation camp at Taxila in 1944 and Archaeological Syrvey of India in 1946.

Originally, Dani had wanted to use his knowledge of Sanskrit for studying Hindus and Hindu Civilization. But, after failing in getting a regular job in his parent University, he was obliged to divert his knowledge of Sanskrit into a different channel. Now, he decided to use his linguistic expertise for furthering his knowledge of history, numismatic, epigraphy and other related subjects. For this he had not to wait for long. At the invitation of Sir Mortimer Wheeler, who had recently joined the Archaeological Survey of India as its Director General, Dani, joined the Archaeological Training Camp at Taxila in 1944 as a representative of Hindu University, Benares. Here, he worked, among others, with some of the promising future archaeologists of the Subcontinent (See below) In Taxila Training Camp, Dani was deputed to work on the site of Bhir Mound under direct supervision of Wheeler. whereas the others worked at the site of Sirkap[10].

His early colleagues of Archaeological Survey of India

Details of Dani's service in the ASI (1946-47)[11] may not detain us here for long except that, although it was brief but proved most eventful and greatly fruitful as far as its visible effect on Dani's future career is concerned. It laid the solid foundation for him in all branches of archaeological disciplines - excavations, explorations, conservation, numismatic, epigraphy which he was required to work in the

[8] Dani has explained at some length the difficulties which he faced during his stay in Benares University on account of his being a Muslim (See: ***Dani ki Kahani,*** pp.79-93, and also see: Nadiem 1993, pp. 4-7).

[9] Dani 1919, p. 8

[10] It looks strange that among all the excavations that Wheeler had conducted in Pakistan and India, only excavations at Sirkap and Bhir Mound have remained un-published. Now for the first time, Dani has revealed, posthumously though, the reason for this. He thinks that at Bhir Mound Wheeler had hoped to find some evidence about the arrival of Aryans in the Subcontinent. But he failed. Perhaps, as Dani presumed, Wheeler never wrote anything about this excavation for this reason. Sirkap Report, however, was soon published under the name of A. Ghosh (See Dani ki Kahani, p.100).

[11] Anybody interested in details of Dani's training during this short period at places like Taxila, Delhi, Agra, Brahmgiri, Ajanta and Ellora caves under the guidance of reputed archaeologists and conservators like Sir Mortimer Wheeler, Dr. Ansari, M. S. Vats, Mahmud Ahmad Khawaja, etc., may see: ***Dani ki Kahani****, pp.98-101 and127-133.*

company of such colleagues who, later on turned out to be some of the most brilliant archaeologists that the Subcontinent has ever produced after Cunningham and Marshall. These include, Maulvi Zafar Hasan, S. A. A. Naqvi, A. Ghosh, B. K. Thapar, B. B. Lal, M. N Deshpandey, Mons. J.M. Casal[12], Ahmad Mahmud Khawaja (of Hyderabd Deccan), T. Khazanchi (in Kashmir), etc - most of them were destined to become the Director General of Archaeology in India, and men like Maulvi Shamasuddin, Q. M. Muneer F.A. Khan, S. A. A. Naqvi, Waliullah Khan, etc. who were destined to become director of Archaeology and Museums in Pakistan in due course of time[13], In Hindu University, Dani's genius in Sanskrit, numismatics and epigraphy had already been wetted by Prof. A. S. Altekar whereas, in modern techniques of archaeological excavation he was trained by Wheeler whereas for his insight into modern archeology of South-east Asia, Dani was groomed by his teachers in the School of Oriental and African Studies, London University like Gordon Child, Cardington, Zoinar, Mallowan, etc. in England and Prof. Paul Levi of France. He was particularly indebted to Sir Mortimer Wheeler for working under him in several archaeological camps - in Taxila and Brahmgiri in 1944-1947 and at Mohenjodaro and Charsadda in Pakistan after 1947. He took training in conservation from Madhu Sarup Vats at Agra and from Dr. Ansari in Delhi. Similarly, he studied art works of Ajanta and Elora Caves in Hyderabd Deccan under the guidance of Khawaja Muhammad Ahmad then Director of Archaeology in that region.

Dani opted for Pakistan (1947) but was posted in East Pakistan against his wish.

This is the maximum one could have learnt during a short spell of about three years (1944-1947), and Dani made full use of these opportunities. The end of this period saw the division of the Sub-continental India and the emergence of the new state of Pakistan. He was still unmarried and was posted in Delhi. The young Dani lost no time and opted for Pakistan hoping that his family from Basna in Chhattees Garh and Amritsar in East Punjab will join him in Lahore or Karachi. . Instead, he was posted in Rajshahi, East Pakistan to work under Maulvi Shamsuddin, the then Superintendent of Archaeology.

Years spent in Rajshahi and Dhaka, East Pakistan (1947-62)

On the 14th August, 1947 Pakistan was declared as an independent state. Dani was in Delhi on that day. As he had been already directed, next day he took an east- bound train to Rajshahi (East Pakistan) via Calcutta. But this was not his own choice. Being one of the three senior-most officers in the Department of Archaeology, Government of Pakistan he was hopeful to soon get himself transferred to any station in West Pakistan where his family from Basna and Amritsar was waiting for him to live under one roof. But, this proved only an

[12] French gentleman Mons. Casal of Musee Guimet, Paris was later made the Director of the French Archaeological Mission in Afghanistan (where he excavated the site of Mundigak, and in Pakistan for several years. In Pakistan he excavated at the prehistoric sites like Amri, Nindowari and Pirak .In Brahmgiri, Madras, he was the pupil of Mortimer Wheeler. Luckily, I started my career as field archaeologist under this very Mons. Casal. For two consecutive seasons he was my teacher in excavations at Amri and Nindowari and in explorations in Baluchistan in early 1960s'.

[13] Dani, in one of his interview given to one of his former Bengali students in Dacca University (Mamoon 1991, p. 33), explains that at the time of Independence only two officers were senior to him. One of them was Maulvi Shamsuddin Ahmad under whom Dani worked in Rajshahi without any grudge of seniority. Dr. Dani claims that the other one senior to him and the posted in West Pakistan did not have proper academic qualification points to only one person i.e. Wali ullah Khan. For this reason Haji Waliullah Khan could not become Director and retired from his service as Superintendent of Archaeology, West Pakistan Circle. However, soon after his retirement, he was appointed as Director Conservation in Auqaf Department and still later as Advisor for Conservation (Auqaf) in the Punjab Government. When I was appointed as the first Director General of Archaeology, Punjab in 1991, he was my immediate boss.

illusion for next 13 years. Several times he requested and yelled for his transfer and on failing he threatened to leave the department if he was not transferred to West Pakistan. He was considered to be one of the most favourite officers of Sir Mortimer Wheeler, his former teacher who was now the head of the Department in Pakistan. But even he could not arrange his transfer to West Pakistan. Actually, Wheeler wanted Dani to stay back in East Pakistan and write for him the chapter for his forthcoming book: **Five Thousand Years of Pakistan**[14]**.** Besides this, there was a small group of officers in the Department who conspired to and always succeeded in keeping him away from West Pakistan. He decided to join his service in East Pakistan but, the thorn of forced separation from West Pakistan always pricked his heart[15]. This opportunity came in 1962, when due to political unrest, Dani found life in Dhaka unbearable and on finding the first opportunity. Dani left Dhaka at a time when non except he himself wanted to leave East Pakistan - then his bread-basket for thirteen years.

But apart from his passion for posting in West Pakistan, Dani's stay in East Pakistan proved lucky for him in more than one way. When he arrived in Rajshahi, he was still a non-entity in academic circles. But in 1962, when he left Dhaka of his own accord, he was well known personality and an author of several articles and some very significant books at his credit. Indeed, Dani owes a lot to East Pakistan and its people - especially for what did he do for the people and the institutions of this part of the country. And hereafter, I intend to narrate such incidences which still make Dani an adorable person in that part of the world now called Bangladesh.

The first thing which Bangladesh owes to Dani is that he saved a large number of antiquities from Dhaka Museum to be permanently transferred to Calcutta - now Kolkata at a time when the baggage was ready to leave for its destination in India. (See below: Division of Antiquities, p14)

The second great achievement of Dr. Dani during his stay in East Pakistan was starting The Asiatic Society of Pakistan, Dacca in 1950 with the support of the Provincial Minister of Education and his own Vice Chancellor. Dani became its first General Secretary as well. With the financial support provided by Mr. Mumtaz Hasan, the then Finance Secretary of Government of Pakistan through the courtesy of Mr. S. M. Ikram an old bureaucrat, In 1956 Dani was able to start publication of the **Journal of Asiatic Society of Pakistan** - now-a-days Journal of Asiatic Society of Bangladesh - a singular achievement of Dani for which the Bangladeshi scholars will ever remain obliged to him. Two years after the foundation of Asiatic Society of Pakistan in Dhaka, at the occasion of History Conference in Dhaka, Dani managed to publish a preliminary edition of his Book: **Dacca - A Record of Its Changing Fortunes**[16]**.**

In those days, having PhD degree was almost a pre-requisite for future success of a university teacher. Without PhD degree no one was expected to rise up to the post of Professor. To remove this stumbling block, Dani obtained study leave without pay for two years (1953-55) for higher study in England. Here, not only he obtained his PhD degree within a stipulated time, from the School of African and Oriental Studies (London University) but for the first time was able, through good office of his

[14] Dani complains at one place that he wrote the half part of Wheeler's book (**Five Thousand Years Of Pakistan)** but Wheeler got it published under his own name.

[15] At times he was feeling that all of his seniors were lined up in thinking that Pakistan can be saved only if he stays in East Pakistan even if it meant destruction of his whole family (See: ***Dani Ki Kahani***, p. 153).

[16] The proper edition of this book was published in 1956 and was revised in 1962.

former teacher Sir Mortimer Wheeler, to develop personal contacts with some of the great scholars of his time - scholars like Prof. Gordon Childe, Prof. Codrington, Prof. Mallowan, Prof. A. L. Basham, Prof. A.C. Christi, and Prof. Levi of France. These contacts benefitted him greatly afterwards. But, when he was back in Dhaka, he felt that instead of being beneficial, his higher educational qualification was proving a stumbling block. Actually, those days University rules laid down that in one Department there can be appointed only one professor. The post in his Department was already occupied by Prof. A.B. A. Halim. His Chairman, once told Dr. Dani that unless he (Prof Halim) dies, resigns or retires, Dr. Dani cannot become professor[17]. In the meanwhile Dani also developed some difference with his Vice Chancellor over the issue of extension of Dhaka Museum of which he had been the Curator from the first day of his appointment in Dhaka University in 1950. These differences became imminent when Dani abstained from attending the inauguration ceremony of the of the new Museum. Everybody started questioning this incidence. It was probably due to incidences like this plus the deteriorating political situation in East Pakistan in early days of 1960's - more probably the latter than the former, that Dani once again started looking back towards West Pakistan for a job and a permanent residence,

Keeping in view these conditions in 1961/62, Dani applied for a post of Professor of History in Karachi University. But his application was turned down at source because, he was told, that his Chancellor (Prof. Dr. Mahmud Hussain) himself was interested in the same post and that Dani must stay back in Dhaka at any cost. It was then that Dani decided that he was not going to stay in Dhaka anymore. "I will be going back (*to West Pakistan*) one day" he said to himself [18] This time, he had not to wait for long. "Only a few days after this", he received a letter from the Vice Chancellor, Peshawar University offering him a post of Professor and head of the newly created Department of Archaeology. According to Dr. Dani the Department of Archaeology was established at the explicit desire of Field Martial Muhammad Ayyub Khan, the President of Pakistan and it was he who also recommended the name of Dr. Dani for this post[19].This time the Vice Chancellor of Dhaka University had to relieve him, reluctantly though. He had to leave Dhaka because, as already has been stated above, the working conditions there had become intolerable. But still, he was able to manage to publish the revised and enlarged second edition of his book **Dhaka** and dedicated it to the students of Dhaka University which he left the same year i.e. in 1962.

Among other things, Dani's greatest achievement in Dhaka was the total transformation of Dhaka Museum of which he had been the Curator right from day one in the University. Earlier, N. K. Bhatashali had virtually consolidated its foundation. However, it was Prof. Dani who expanded it, and made it an institution worthy of a university. It was now a popular place to be visited by Dhakaites. The Museum which he had inherited comprised, as Dani has described, some statues and some gold and silver coins and that is all. With Dani's endeavours within a short time Dani not only enlarged its collection but even rearranged its display in such a way that pleased everybody. For example he took all the Hindu and Buddhists sculptures from their open display in the garden and rearranged them inside the museum. He also improved the Islamic image of the Museum by adding several valuable collection donated by some

17. Mamoon 1991, p. 52.

18 . Mamoon 1991, p. 56.

19 Mamoon 1991, p. 56.

important families of Dhaka. such as families of .S. M. Taifoor[20], Abul Hasanat, Nawab Abdul Latif, etc. Side by side, Dani started writing articles in newspapers and periodicals. Simultaneously, he also started delivering lectures here and there. Soon Dani was a popular figure in Dhaka. He also developed his relationship with his colleagues in the University. Public trust in him started growing and families after families came to offer their collections until there was no more space in the Museum. There came a time when even the collection of **Balda Museum** was transferred to **Dhaka Museum**[21] One of the reasons of his popularity with the local people was that he and his family was always talking with them in Bengali. Most of them believed that he was a Bengali. At this time none of his family members, including himself, knew Punjabi language. There then came a desire to learn Punjabi language. Thus, it was in Dhaka that that the man (Dani) who had learnt more than a score of languages of his country, started leaning his own mother tongue in a part of the country where it was greatly despised. It was thus, during their stay in Dhaka that Dani and his family started learning Punjabi. Thus learning Punjabi language in Dhaka was indeed a byproduct of his stay in East Pakistan.

Division of antiquities between Pakistan and India

Before we proceed any further, I would like to talk about another serious matter of our history that in the main still remains a mystery for most of us i.e. . the issue of the division of cultural assets between Pakistan and India as a result of Partition of the Punjab and Bengal in 1947. I will narrate this incidence only as far as it relates to the two most important archaeologists of our country namely Dr. Dani and Dr. F. A. Khan. Ihsan H. Nadiem, in his interview of Dr. Dani, published in 1993, has recorded Dani's statement vis-à-vis Division of Antiquities between Pakistan and India in 1948 which finally resulted into loss to Lahore Museum about 40% of its collections[22]. In this interview, Dani has claimed that he. and Mr. S. A. A Naqvi[23], both of them then young officers of the Department of Archaeology, Pakistan, tried their best to hold back the decision with regard to antiquities from Lahore Museum going to India. However, as Dani was then posted in East Pakistan, he succeeded at eleventh hours, in persuading the authorities not to let go the antiquities from Dacca Museum, which were already packed and ready to leave for Calcutta.[24] This statement is interesting, but has confused me for two reasons. Firstly, Dr. Dani has completely omitted this statement, or any part of it, in his posthumous autobiography and secondly partly this statement goes contrary to the statement of Dr. F. A. Khan, the former Director of Archaeology, Department of Archaeology and Museums, Government of Pakistan (1958-1970). This statement was made by Dr. Khan in an interview recorded in 1992 but published only recently[25]. It is strange that Dr. Dani makes no refrence to any role of Dani or that of Mr. S. A. Naqvi. In his statement. Dr. F. A. Khan no doubt talks about his failure to prevent partition of the cultural property belonging to Lahore Museum but claims credit

[20] The author of the first-ever n book on Dhaka and father of the famous singer Laila Arjmund Bano.

[21] Mamoon 1991, p. 48.

[22]. Nadiem 1993, pp. 9-10. .

[23] Later on Superintendent, National Museum of Pakistan, Director, Department of Archaeology, Pakistan and Director, UNESCO for Asian Affairs, Paris.

[24] .The main person in the Partition Committee is said to be one Khan Bahadur Asadullah Khan, the Librarian of the Imperial Library, Kolkata. According to Dani, this man was inclined to show his favour to India. He was bent upon dividing the cultural assets both of West Punjab and east Bengal in Pakistan but not those of East Punjab and West Bengal in India. He succeeded in getting the share from Lahore Museum but failed to get anything from Dacca Museum - thank to Dr. Dani.

[25]. Saifur Rahman Dar and Muhammad Rafique Dogar. "Dr. F. A. Khan - The Builder of Modern Archaeology in Pakistan" In: AASAAR , Vol.2, Number 2, July-September 2021, pp. 100-101.

of bringing back some important antiquities from India as Pakistan's share.

Taxila Camp - re-visited

Once again, we turn back to the Training Camp at Taxila. Although Dani joined this camp as a representative of Hindu University, Banares, at the end of this Camp he was soon selected for appointment as a regular officer in the Archaeological Survey of India along with Mr. Waliullah Khan - the only two Muslims selected on basis of minority quota. This, hurt Dani very much. He felt that selection of Waliullah Khan on minority quota was Ok because he was not properly qualified. But, being a gold medalist from a University, he was better qualified to be selected on merit instead of on minority quota. [26] It may be interesting to note that there were quite a few other Muslim archaeologists who were senior to Dani in service of the ASI such as Q.M. Muneer, F.A. Khan, S.A.A. Naqvi Maulvi Shamasuddin Ahmad, etc. He seldom talks about them. But strangely enough, Mr. Waliullah Khan, whom he regarded as much less qualified than him, was promoted as Superintendent of Archaeology, West Pakistan in 1948[27], but Dani remained Assistant Superintendent till he resigned from the department in 1950. Thus, as an archaeologist in the government department, Dani did not stay for a long. Actually, to me young Dani, was destined to walk on a different path. Government service did not suit his temperament. Throughout his remaining life the sad feeling never left Dr. Dani that despite his conscious efforts, a small group of his colleagues conspired to keep him away from posting in West Pakistan. This did a great harm both to him personally as well as to the Department of Archaeology

After joining Peshawar University (1961-1970)

But Dani did not stay in Dacca for a long time. At the explicit desire of Chaudhary Muhammad Ali, the Vice Chancellor of Peshawar University, and on the persuasion of General Muhammad Ayyub Khan, the President of Pakistan through the Governor of East Pakistan, Dani resigned from Dacca University[28] and joined Peshawar University in 1961 as Professor and head of the newly created Department of Archaeology. Very soon, this posting proved auspicious both for Dr. Dani himself and the subject of archaeology because it was followed by starting teaching of Archaeology in a few other universities of KPK Province as well as in other provinces - such as Sind and the Punjab. Thus, Dani became an instrument in popularizing archaeology in Pakistani colleges and universities[29]..

In some other ways too, Dani's arrival and stay in Peshawar for almost a decade proved both very eventful and fruitful. He gathered around him a team of energetic, talented and hard working young teachers and field workers. Soon, new discoveries at several sites such as the Megalithic site at Sanghao, the sites of

[26] . See: ***Dani ki Kahani***, p. 127. This remark of Dani against Waliuallah Khan seems to be expressed inadvertently. Latter being less qualified than Dani was not his problem. Actually, what he had meant by his remarks that Waliulla Khan, for his lesser qualifications, might have been selected against a minority seat but why he was treated at par with him. He was fully qualified to be selected on merit. It has never been Dani's wont to criticize his colleagues -least if they were senior to him.

[27]. M. Waliullah Khan remained Superintendent of Archaeology till he retired in 1960's. But after his retirement he was appointed as Director Conservation Cell, Auqaf Department, Punjab Government. Later on he was made Director of Archaeology, Punjab and still later, as Advisor to the Chief Minister, Punjab. This post he enjoyed till his death in 1991. In short, Late Waliullah Khan .has been duly recognized as one of the best conservators Pakistan has produced. His services are comparable with Dr. Ansari, the Chief Engineer, of the Archaeological Survey of India.

[28]. As regards Dani's achievements during his stay in Dacca University (1950-61), see below: Phase I of His Life (1947-1961).

[29] **Khan and Shaheen 2015** ("Ahmad Hasan Dani's Popularizing of History, Archaeology").

"Gandhara Grave Culture"[30] at Timargarha in Dir and Proto-Indus site at Rehman Dheri pushed the frontiers of archaeology of KPK Province deeper into the unfathomed antiquity. His fresh excavations at Shaikhan Dheri (ancient Pushkalavati), in collaboration with Professor Raymond Allchin - his class fellow in London University, added new dimensions onto the impact of Greek contribution in our history and civilization. His excavations at Timargarha and at Chakdara opened up new vista of archaeological discoveries in the former Dir State and helped government to establish an archaeological-cum-ethnographical museum at Chakdara i.e. Dir Museum. His identification of the authors of Gandhara Grave Culture in Dir, Bajaur, Chitral, Swat, Peshawar, Taxila, etc with the Aryans as successors of people of Indus Valley Civilization and dating of these new arrivals, however, remained under dispute for sometime between him and his colleagues in the West - particularly the Italians scholars working in Swat. The latter, identified the people of Gandhara Graves as **Dards** and not **Aryans** as was initially claimed and successfully propagated by Dani. However, as already explained above, Dani, a little before his death, withdrew his hypothesis calling it "his mistake"[31]. However, Dani did not live long to offer an alternate nomenclature of this iron age culture. In popular writings , therefore, the old name still continues.

Dani, now Professor and PhD, became the pioneer in launching the first-ever archaeological annual journal in Pakistan – **Ancient Pakistan** in 1962. This journal was used as a vehicle for publishing his excavation reports and research papers on archaeology and its related disciplines. This journal, which is still being regularly published, set up an examples for several other journals about heritage study by other institutions. This journal is an outstanding legacy of Dani towards archaeological studies in this country. All other journals devoted to archaeological and heritage studies were started after Dani's two journals i.e. **Ancient Pakistan and Journal of Central Asia**[32].

Dani joins Islamabad university (1971)

But, Dani's stay in Peshawar was not as long as he had wished it to be. In his autobiography, he has admitted, shyly though, that he left Peshawar against his will and wish. Indeed, he appears to have been obliged to leave this city which had raised him to be a celebrity in the field of archaeology due to jealousy of some of his colleagues[33] whom he desists to mention by their names. This may be true but to me, actually, Peshawar was too small a base for the world of archaeology which Dani had created

[30]. The term "**Gandhara Grave Culture**" was suggested by Dr. Dani as applied to a group of iron age graves discovered by him at a number of sites in Dir, Chitral, Bajaur, Swat, Peshawar Valley, Taxila and Kashmir. The term was applied to an assemblage of artifacts such as pots and pans, terracotta figurines, stone objects, iron objects, etc found buried in graves along with human bodies in a variety of ways - cremated, post-cremation fractional burials etc. Dani propagated this term against the views of some foreigner archaeologists - particularly the Italian group working in Pakistan. But when finally the dust settled in favour of Dr. Dani, he turned his back and, ,in his posthumous autography, suddenly declared that his naming this culture as Gandhara Graves Culture " was a mistake (See: ***Dani ki Kahani***, p. 9) .He, however, did not suggested an alternate name for the same.

[31]. ***Dani ki Kahani***, p.9.

[32] For example **Pakistan Archaeology,** the official journal of the Department p of Archaeology and Museums**,** was started in 1964; **Journal of Central Asian** in 1978, the **Biannual Lahore Museum Bulletin** in 1989, **Ancient Sindh** by SAL University Khairpur in 1994; **Punjab Journal of Archaeology and History by**, Directorate General of Archaeology, Punjab in **(1997); Frontier Archaeology** by Peshawar Museum in 2003**; Pakistan Heritage by** Hazara University in **2009**; **Ancient Punjab by** Department of Archaeology, Punjab University in **2010; Gandharan Studies** from Peshawar in 2007, and **Antiquity of Sind** by the Department of Antiquity, Sind Government in 2017, etc. The only exception was the Journal of Museums Association of Pakistan which was started in 1951. None except two journals (**Ancient Pakistan** and **Journal of Central Asia** (now renamed as **Journal of Asian Civilizations**) is regular. Another quarterly research journal of quality named **Journal of Archaeohistorical Studies (AASAAR)** has been started only recently (2021) by an organization called **Roads and Religions Research Initiative**.

[33] *Dani ki Kahani*, p. 178-179.

around him. Some other circumstances might have also obliged him to seek his fortune elsewhere. In 1971, therefore, he opted for Islamabad, then the up-coming Capital of Pakistan, as a spring board for his scholarly pursuits. He was appointed as Dean of Anthropology, Faculty of Social Sciences (1971-75) and Professor of History (1975-80) in the Quaid-i-Azam University and started teaching archaeology within a broader framework of anthropology. In 1972, besides teaching, he also started the Central Asian Studies Center along with the publication of the biannual Journal of Central Asia (in 1978) with the cooperation of UNESCO. He was the honorary Director of this Centre from 1972 to 2009 and also became the Honorary Director of Taxila Institute of Asian Civilizations, Q U, Islamabad during 1997-2009. He donated the entire collection of his personal library to this institute which is providing a great assistance to scholars and students of history, archaeology, anthropology and all other related subjects. After his retirement in 1980, he was appointed as Professor Emeritus in the Q.A. University, Islamabad. The Journal of Central Asia was also re-designated as the Journal of Asian Civilizations as at present. A few years before his death, the Higher Education Commission appointed him as a National Professor - a singular honour to be conferred on an archaeologist in this country. From above, it is clear that departure of Dr. Dani from Peshawar University did not create any dent in his career. Instead, it boosted it.

Dani's roamnce with Northern areas of Pakistan and Central asia

Establishment of Department of Archaeology in Peshawar University and Taxila Institute of Asian Civilization in Q. A. University, Islamabad, are the two everlasting memorials that will always remind us Dani's contribution towards the study of Asian Civilizations in general and the archaeological heritage of Pakistan in particular. In the same way, launching annual research journal "**Ancient Pakistan** (1962) and the Journal of Central Asia in 1978 (now renamed as **Journal of Asian Civilizations** both started by Dani, are the two oldest research journals devoted to the subject of archaeology of South and Central Asia with special refrence to the archaeology of Pakistan The contributions made in the Journal of Central Asia and its successor **Journal of Asian Civilizations**, have played a pioneer's role in bringing Central Asian and Pakistani scholars closer to one another

Dani was no doubt the most respected Pakistani scholar in all the Central Asian States even before these became independent. The confidence of Central Asian scholars, their respective governments, as well as those of USSR and the authorities in UNESCO reposed in Dr. Dani's ability is confirmed from the fact that when UNESCO inaugurated **The Steppe Route Expedition In USSR In 1991 As A Part Of The Integral Study Of Silk Roads: Roads Of Dialogue.** Dr. Dani was unanimously elected as the Scientific Leader of a multinational and multidisciplinary team[34]. More than hundred scholars from more than 20 countries participated in this Expedition. I have the honour to be one of the members of this international expedition for a little over two months as a representative of Pakistan. Together, we (Me. and Dr. Dani) travelled from Karachi to Moscow and then to Ashkabad in Turkmenistan by air and then by road from Ashkabad to Khargosh (Kazakastan) on the western border of China. passing through all the then Central Asian Republics (now States) like Turkmenistan Uzbekistan Tajikistan, Kazkistan and

[34]. According to Dr. Dani, the idea of Silk Road Expedition from the USSR to the Subcontinent was first floated by him in one of UNESCO meetings held in Paris. Initially, both USSR and France had some reservations. But ultimately, they agreed and appointed him as the Scientific Leader of Russian Steppes Expedition along with Professor Ahmad Ali Askarov of Uzbekistan as its Co-Leader whereas Dr. Doudou Diene as UNESCO Co-coordinator of this Expedition.

Kyrgyzstan,etc through the vast and hot deserts of Karakorum and Kyzyl-Kum and snowy mountains of Pamirs and Hindukush. During these long journeys, I often had the good fortune of sharing with Dr. Dani a room in some hotel or some space in a Turkish style round tent. This provided me an opportunity of understanding him from a very close.

The result of this Expedition was the publication of three books by Dani namely: ***Rediscovery of the Civilization of Central Asia** (1991), **New Lights on Central Asia** (1993) and **Central Asia Today** (1996),* beautiful readings of the rich cultural heritage of all the Central Asian States from a Pakistani perspective. He received several honours and awards from some of the Central Asian States. For example, Uzbekistan confirmed on him the **honorary Citizenship of Bukhara** (1991) and Tajikistan confirmed on him ,the award of **Honorary Member of "Paivands Society"** (1991) and **honorary degree of doctorate** (1993). Similarly, several other countries also confirmed on similar honours such as: **Knight Commander** by Italy,(1994), **Order of the Merit** by Germany (1996), **Aristotle Silver Medal** by UNESCO (1997), **Order National de "La Legion D'Honneur** (with the **grade of Chevalier**) by the French Government (!998). Government of Pakistan did not lag behind and confirmed on him several honours such as **Sitara-i Imtiaz** (1969), **Ezaz-i-Kamal** (1992), **Hilal-i-Imtiaz** (2000), and **Distinguished National Professor** (2004), **Advisor on Archaeology**, Ministry of Culture, Government of Pakistan (1992), **Chairman, National Fund for Cultural Heritage**, Islamabad (1994-98), etc.[35]

At home, Dani was member Boards of Governors of several bodies such as Lahore Museum; Peshawar Museum; Dir Museum; Islamabad Museum of which he was also the founder member; member, Preservation of Moenjodaro Authority; National Fund for Cultural Heritage as well as the First Chairman of the Executive Committee of the last named Board. He was also the President of Pakistan Society for Archaeology, Archives and Museums. He also donated a handsome amount to this Society for the award of **Dani Gold Medal** for services in the field of archaeology and museums.[36] He was the man behind the establishment of the **Islamabad Museum** (1993).

In his own life-time, Dr. Dani donated the entire collection of his personal library to the Taxila Institute of Asian Civilizations, Q.A. University, Islamabad which is proving of utmost assistance to scholars and students of history archaeology, anthropology and all other related subjects.

Rediscovering Northern Ereas of Pakistan

After leaving Peshawar, his greatest contribution to Pakistan's archaeology is his remarkable discoveries which he made in the Northern Areas of Pakistan. This part of the country had so far remained a no-go area for archaeologists and anthropologists - local and foreign. Dani explored the entire region along the Karakorum Highway from Taxila to Khunjerab Pass - the most difficult terrain on the earth ever treaded by archaeologists. He documented thousands of petroglyphs and inscriptions all along the newly built Karakorum Highway from Taxila to Khunjerab Pass. The inscriptions in particular were most illustrative of the history of the area. These inscriptions were found in all languages and scripts which this country has experienced in the past –

[35] . For fuller details of these and many other academic awards confirmed on him by national and international organizations see Gul Rahim Khan, Ancient Pakistan, XX, 2009, pp, 261-, 263 and 270.

[36] The first Dani Gold Medal was awarded to Dr. F.A. Khan in 1998. Unfortunately, soon after this, the Society, for a number of reasons, became dormant. With this all funds of this Society, including funds of Dani Gold Medal, have also become dormant and are waiting for the Society to be revived and legally claim its assets.

Chinese, Korean, Arabic, Persian, Sanskrit, Sharda, Kharoshthi, Sogdian and Bactrian languages and scripts. Here Dani, the epigraphist and linguist proved his worth. A comprehensive study of these petroglyphs and inscriptions unraveled for the first time the history of this region from Prehistoric times to the more recent events of history. His voluminous writing on history and archeology of this region will remain a classic contribution for all times to come. In 1983, he organized the first-ever international conference in Gilgit on the Cultures of the Northern Areas in which foreigners were also allowed to visit this area for the first time.

My acquaintance with Dani

My acquaintance with Dr. Dani covers almost half a century – 47 years to be exact. Our relationship was always that of respect and ranged between close family ties and being colleagues. Though, I was never his student in the common sense of the word, but throughout the period of my academic life, I regarded Dr. Dani as my teacher, a mentor and guide. My longest continuous association with Dr. Dani was in Lahore Museum (1973 to 1995) when he was member, Board of Governors, Lahore Museum[37] and I was Board's Secretary in my capacity of a heritage-manager of a large institution like Lahore Museum. I have learnt from him many things in my academic pursuits. Particularly, he taught me how to diversify my limited intellect and knowledge and as how to have satisfactory grasp on all subjects and branches of knowledge with which I may have to grapple with as director of a large institution like Lahore Museum, as a teacher, excavator, and many other matters in service of cultural heritage. Thus whatever little name I have been able to earn, I owe it to my specialized me in investigating, projecting and protecting the national heritage - all is due, in the main, to the guidance of Dr. Dani. During this long period twice I availed of his services in conducting two training courses for museum curators - one each in specialized fields of epigraphy[38] and the other numismatic.[39]

The life that Dani lived

Dani was the most balanced man I have ever met in my life – cool in mind, sober in opinions and generous when dealing with juniors seeking his guidance and assistance. I seldom saw him in fits or fury. But still, no one ever took an advantage of his polite, calm and silent demeanour. He never kept anyone waiting but himself, he never waited on anybody for favour or help. He always was ready to play host but seldom, if ever, wanted to be an unwanted and un-welcomed guest. He always took pleasure in meeting his colleagues, friends and students at his residence and play host to them. The Lady behind the scene in his house – Begum Safia Dani, was always there to entertain her husband's visitors and facilitate their visits.

Most of the times he was seen dressed in suit, tie and hat and was well groomed both in speech and manners. But, at heart of his hear, he always remained a true Pakistani. He always lived a life of decent standard permitting his means. He knew almost all local languages of Northern Subcontinent - from Bengali to Pashto, but in private life he always preferred to talk in Urdu or Punjabi. Dr. Dani was a real Kashmiri Pundit with extremely white complexion (many took him to be a *Gora Sahib*). He always took pride in identifying himself as a Kashmiri, but strangely enough the only language he did not know well was his mother tongue. That was perhaps the only real regret of his life. He always pressed me to learn Kashmiri language lest in the later days of my later life I may have

[37]. He was member, Board of Governors , Lahore Museum from 1966 to 1995 and I joined Lahore Museum in August 1973.

[38]. The result of this programme was the publication of his book entitled **Kharoshthi Primer**, Lahore Museum, 1979.

[39]. As a result of this programme, Lahore Museum published Dani's book: **Bactrian and Indus Greeks - A Romantic Story of Their Coins,** Lahore Museum, 1991,2

to regret like him. Regrettably, this is the only advice of Dani which I could not follow seriously. Once we were together visiting Sarai Hindian in Bokhara. I suddenly saw Dani's face ablaze with pleasure and pride. "See Dar!" he invited my attention, "it was here in this Sarai that my grandfather and great grandfather used to stay in connection with their trade of Kashmir shawls. I do not know which room or rooms they stayed in, but it was certainly here. I can feel their presence all around".

Dani has travelled extensively

Dani had travelled widely and extensively. There was hardly a country which he had not visited -- most countries more than once. But after his retirement, the most favourite areas of his interest were Central Asian Republics, Turkey and Chinese Turkistan. His services for these areas have been acknowledged and appreciated at all levels and in all quarters in those countries. During these long journeys in Central Asia I had the feeling that probably Dr. Dani was better known and respected in these countries than in his own country.

Dani was proud for his green passport

Dani had many chances - and at time lucrative offers of service and residence abroad. But he always preferred to stay back and serve his own country. We, his friends, admirers and well-wishers have always felt that perhaps this country is too small for him, that it has not acknowledged his services in an appropriate and official way. But Dr Dani himself never complained about it. I always found him contended and satisfied with what he possessed and was offered. He once told me that he was always proud to be identified as an honorable Pakistani rather than an ordinary citizen of USA, UK, Australia or any European country. All of his children completed their studies in Pakistani schools, colleges and universities. Only his eldest son - Dr. Anis Dani, after finishing his university education in Pakistan with two degrees in M.A. took his PhD degree from an American university. I met him there in 1978 in New York where he was then studying. Despite his high contacts, both inside and outside the country, Dani never encouraged his children to settle abroad. However, Dr. Anis Dani, his eldest son, now serving an international mission in Washington D.C., was obliged to leave the country as a result of political victimization during Gen. Ziaul Huq's regime. During his last days in London (1953-55) Dani once met an old acquaintance - an old bureaucrat and the renowned historian Mr. S. M Ikram[40]. Mr. Ikram advised him not to go back to Pakistan after finishing his studies in London. Dani replied to him that although there is no problem for him to find a job in England and earn money, but he had no intention of settling here because it is not his land, the culture of this land is not his culture and that he and his family will never be comfortable here[41].

His regrets were few

Regrets in Dani's life were very few and mostly small ones. To the best of my knowledge his greatest regrets were about half a dozen namely:

1.His failure to learn properly his mother tongue i.e. Kashmiri language.

2. Due to professional jealousies (he terms these as conspiracies) and despite his seniority and better qualifications, he was never allowed to serve in any part of West Pakistan - present day Pakistan. This ultimately obliged him to resign from Government service at a very early age (1950). He was already a grade I officer in the federal Government - a post of the grade then enjoyed great honour and respect. Pakistani archaeologists of my age may be reminded that

[40] The author of famous books like **Mauj-i-Kausar, Aab-i- Kausar and Rud-i-Kausar**

[41] . **Dani Ki Kahani,** pp. 111-112.

back in 1950's and early 1960's the selected candidates with their M.A. degrees for regular appointment as a professional archaeologist fist had to undergo a period of two to three years training as internees on a fixed emolument of Rs. 250 per month and only successful individuals were given a permanent post in grade 15.@ Rs. 185/-pm. When Dr. Dani resigned from Government service he was drawing a salary of about Rs. 800/-pm. Now to resign from such a prestigious post without any guarantee for a future job, needs some guts which Dani definitely possessed.

3. Despite his desire and efforts he was never considered for any job in the Punjab University for teaching archaeology. Dr. Dani's small regret for never having been considered for teaching archaeology or history in the Punjab University stems out of the fact the in the past this University has produced some important personalities in the field of Indo-Pakistan archaeology and history. He wanted to share this honour by producing a few more respectable names in this field from the platform of this very University. But, perhaps his fame and story of his success had never reached the ears and eyes of those who mattered for such an appointment. Or, more perhaps, because they were afraid of his academic stature. The result is that even the Department of Archaeology in this oldest University is still staggering for its survival despite the fact that several of its former students have risen to the status of Director General of Archaeology and of National Archives[42]

4. He was obliged to leave Peshawar University against his wish due to jealousies of some of his own colleagues.

5. He failed to revive the ancient University of Taxila in Taxila or in Islamabad either with the same name or in the name of Gandhara University for Buddhist Studies. However, he was partially compensated for his desire with the establishment of The **Taxila Institute for Asian Civilizations** in the Q. A. University, Islamabad.

6. He was regretful for the treatment which his eldest son was met with during General Ziaul Huq's regime at a time when Dani himself was considered to be quite close to the General. But, Dani avoids mentioning this fact in his autobiography and hence I also refrain from going into further details of this case.

His publications

I do not remember the exact numbers of Dani's books – it must run between 40 and 50. Himself, he never kept a list of his publications[43]. Particularly, the number of research papers, and review articles must run into several hundreds. But what I remember well is the fact that Dani never left a work half done. Whatever he explored and whatever he excavated immediately thereafter he sat down to write his reports and got them published them. His publications covers a large spectrum of areas all over Central Asia and South Asia and all periods of history ranging from prehistory to the Pakistan Movement and varied subjects from stone implements to coins.

It may be interesting to note that Dr Dani never closed himself behind a few selected topics and subjects. His canvas of writing knew no border. His writing have no frontiers of time

[42]. The subject of archaeology, as a specialized group of subject, was started being taught in the Punjab University sometimes in the middle of 1950's as part of history. Several former students of this Department have risen to eminent posts in the Department of Archaeology and National Archives For example Dr. Muhmmad Rafique Mughal and Dr. Saifur Rahman Dar became Director General of Archaeology whereas Atique Zafar Shaikh became he Director General of National Archives. Similarly Muhammad Abdul Halim and Haji Abdul Aziz Faruq rose to the posts of Deputy Director of Archaeology and M/s Khan Muhammad retired as Deputy Director of Archaeology and Ghulzar Muhammad Khan retired as a senior Curator in the same Department, etc.

[43] Professor Gul Rahim Khan has published a comprehensive list of Dr. Danni's publication. See Khan 2009, pp. 261-272..

and place. When he was in East Pakistan almost all his books and most of his articles appertained to subjects of archaeology, history and arts and crafts of East Pakistan in particular and whole of Bengal and Eastern India in general. When he landed in Peshawar, during all the coming next almost ten years he remained riveted to the area and through his efforts and writings he changed the whole historical and archaeological profile of the KPK Province. However, when he shifted to Islamabad in 1971, Islamabad and Taxila, the whole Northern Areas including Kashmir and Central Asia became the focus of his attention and activities. Now archaeology was a smaller part of the canvas of his studies and his operations.

To the best of my knowledge Dani published his first paper in 1950[44]and his last two papers in 2000 - both reprinted in 2003[45] whereas the total number of his papers and review-articles exceed figure 200. There may be some unpublished papers in his private archives[46] I myself have copies of his two unpublished articles. What baffles the readers is not the number of books and papers that Dani wrote; it was the diversity of subjects he covered that astonished his readers. He once told me that he seldom re-read what he wrote and his Stenographer typed for him. Dani was as good an eloquent speaker as diverse he was as a write. He seldom prepared notes beforehand for his speech on any forum. However, towards the end of his life he developed a sort of dementia. While speaking he often used to repeat his point unnecessarily. which only his old listeners were able to detect.

[44] "Hariyupiya in the Rigved" in Varendra Research Society's Monograph No.8, Rajshahi, 1950, pp. 17-24.

[45].(a.) "Arts and Crafts - Part 3 - Hindu and Buddhist Arts and Crafts: Tiles, Ceramics and Pottery". In: History of Civilizations of Central Asia, Vol. IV, (Part 2), Delhi, 2000, pp.455-460, reprinted in 2003 and (b). Urban Development and Architecture - Part 2. Southern Central Asia" In: History of Civilizations of Central Asia, Vol. IV, (Part 2), Delhi, 2000, pp. 557-573, reprinted 2003.

[46] See Zahir & Hobaib 2021.

An overview of dani's career and achievements

Dani's academic pursuits can be divided into four major periods after his initial brief period exposure (1944-47) with the Archaeological Survey of India including his apprenticeship in the Camp of Taxila under Mortimer Wheeler followed by regular service in the Survey.

Phase I (1947-1962)

This is the period he spent in East Pakistan - now Bangladesh, first as Assistant Superintendent of Archaeology (1947-1950) followed by 12 years (1951-1962) as Reader i.e. Associate Professor in History, in Dacca University. During his stay in East Pakistan he also held the additional charge of the post of Curator Dacca Museum as well as the post of General Secretary, Asiatic Society of Pakistan, Dacca (1950) and Managing Editor, Journal of Asiatic Society of Pakistan, Dacca (1955-62). It was during his stay in this part of the then East Pakistan, Dani started his career as a writer on archaeology, history an architecture. Starting with his first article published in 1950.[47] He published altogether more than 40 articles during his stay in East Pakistan - all pertaining to one or the other aspect of archeology of the eastern part of the Sub-continent. This proved his claim which once he made before Mr. S. M. Sharif, Federal Secretary, Ministry of Education that he has left the Department of Archaeology but not archaeology".[48]

It was again during his stay in East Pakistan that Dani took study leave at half pay and went to England for higher studies during 1953-55. His family accompanied him. He was admitted in the School of Oriental and African Studies, University of London and conducted his research under Prof. Cardington. He was

[47]. The title of his first-ever paper was : "**Hariyupiya in the Rig**veda", published in Varendra Research Society Monograph No.8, Rajshahi, 1950, pp. 17-24.

[48] ***Dani Ki Kahani***, p.102.

admitted to conduct his research on the topic: "**Development of Architecture in Bengal**". According his own statement, the manuscript of his thesis was already complete when he landed in England. However, at last hours, he changed his mind and submitted another thesis on the topic: "**Stone Age of South-east Asia**" and convinced his Supervisor to accept the new topic and got his PhD degree[49].

Phase II (1962-1971)

This phase started with Dani joining Peshawar University as a Professor and Head of the newly established Department of Archaeology in that in 1962. This change proved quite fruitful both for Dr. Dani as well as for archaeology as a new discipline of teaching in Pakistani Universities. Peshawar University was the first Pakistani University to start teaching of this subject at M.A. Level. Dani lost no time in starting in full swing . Beside teaching, he also started exploration and excavation. He also launched the ever-first annual journal for archaeological researches named **Ancient Pakistan.** This journal has proved lucky for development of archaeological studies in Pakistan. Being the ever-first journal of archeology in Pakistan, it has successfully completed the six decades of its existence and is still the most regular to appear annually. Several other journal about archaeology, museology, heritage etc that were launched after **Ancient Pakistan** are either already out of circulation or, most of them - with the exception of only one other [50] are being published erratically.[51]

While in Peshawar, Dani produced the first badge of archaeological scholars and teachers with master degree in Archaeology. Besides, Dr. Dani gave KPK Province a new archaeological identity by pushing its history from 6th century ACE back to Mesolithic period. Dani's efforts to promote archaeology from the platform of Peshawar University was followed in letters and spirits by his successors with the result that Peshawar University now has its own full-fledged archaeological museum called Sahibzada Sir Abdul Qayyum Museum[52]. KPK Province, again, is the only province were archaeology is being taught in more than one university and where more than half a dozen archaeological-cum-ethnographical museums have been established since teaching of archaeology was started in Peshawar University in 1962 and where archaeology is being taught not only in some other universities but also in several colleges of the Province. From Peshawar again, Dr. Dani published one of his most important books - **Indian Paleography** (1963). Besides, he paid his debt to the city that has honoured him so much by publishing his book: **Peshawar - The Historic City of the Frontier** (1968). It is the first most authentic book on the history of the capital city of KPK Province.

[49] In this connection Dani claims that one Mr. Christy had already got this topic registered under Prof Cardington and hence his supervisor was reluctant to allow him to change Danni's new topic. But, when he insisted, Prof Cardington called Mr. Christy and handed him over Dani's manuscript and asked him to compare with his own work. Mr. Christy returned after some days and admitted that Dani's work was better than his and hence he was ready to withdraw his claim. (See: ***Dani ki Kahani***. pp. 103-105).

[50]. **Journal of Central Asia**, Islamabad

[51]. Thus was started: **Pakistan Archaeology** in 1964, **Journal of Central Asia** in 1978**,** Biannua**l Lahore Museum Bulletin** in 1989, **Ancient Sindh -** the Annual Journal of Research of S. A. L. University, Khairpur in 1994; **Punjab Journal of Archaeology And History** of the Punjab University in 1997; **Frontier Archaeology** in 2003 by Peshawar Museum; **Gandharan Studies** from Peshawar in 2007, **Pakistan Heritage** by Department of Archaeology, Hazara University in 2009, **Ancient Punjab**, Department of Archaeology of the, Punjab University in 2010:), Quarterly **Sindh Antiquities** in 2018, by the Department of Antiquities, Sindh Government etc. Out of all these none, except two (**Ancient Pakistan** and **Journal of Central Asia -** now renamed as **Journal of Asian Civilizations,** is being published regularly.

[52]. Following this good tradition, Mardan University has also established an archaeological-cum-ethnological museum named after an archaeologist: Professor Farzand Ali Durrani Museum within the University Campus. This is the first museum in Pakistan that has been christened after the name of an archaeologist.

Before leaving Peshawar, Dani was able to establish a new archaeological-cum-ethnographical museum in Chakdara and named as Dir Museum.

Phase III (1971-1980)

The Third Phase of Dani's career was started after he joined the Q. A. University, Islamabad in 1971 as Dean of Social Sciences. Although in his new place, he was not allowed to start Department of Archaeology, but he continued teaching archaeology and its related disciplines under the guise of anthropology. During this phase Dani, the scholar, exposed himself with full dimensions and diversity of his capabilities. He was now known not merely as an archaeologist, explorer and excavator but also as a historian, ethnographer, epigraphist, numismatist, museologist and what not. More than this he was now an expert in the history and heritage of Northern Areas of Pakistan as well as the now liberated states of Central Asia. For the latter, he established in Islamabad **The Center for Central Asia Studies** in 1972 which, in due course of time, was upgraded as Taxila Institute of Central Asian Studies in the Q.A. University, Islamabad now, once again, renamed as **Taxila Institute of Asian Civilizations,** from 1978 till today. The official organ is now known as **Journal of Asian Civilizations** To this Institute Dani also donated his huge personal Library as well as his personal collection of artifacts which forms the nucleus of a small museum in the Institute.

Here I must refer to two interesting statements attributed to Dani. by Lawrence Joffee in his obituary note published in 2009. In the first place Joffe has claimed that Dr. Dani "also supervised exploration of a shrine at Murree, a hill station in Pakistani Punjab which, some believe, houses the remains of Mary, mother of Jesus". I do not know the source of Joffee's information. But it has certainly surprised me because to the best of my knowledge Dani has never said or written anything like this i.e. Grave of Hazrat Maryam in Murree.[53] The question of Hazrat Maryam's grave in Murree is related to the issue of Saint Thomas' visit to Taxila and his assumed conversion of the local king to Christianity as well as to the so-called discovery of the "**Taxila Cross**" allegedly claimed to have been discovered from Sirkap in 1920's. In 1970's and 1980's some local Christians tried to glorify this assumed event. In order to resolve this issue, The Christian Study Center, of Pakistan Christian History Society, Rawalpindi arranged a seminar in May 1988 in which they invited two Christian[54] and two Muslim scholars[55] for discussion. Papers presented in this seminar and fuller discussions thereon were later printed in full[56]. Suffice here to say that none of the scholars - including Dr. Dani, uttered a word about "Mary's grave in Murree or Dr. Dani himself talking about his exploration in connection with Hazrat Maryam's Grave and results there of - positive or negative.[57]

In another part of his Obituary Note about Dani, Lawrence Joffe credits Dani "for alighting in 2007 on a human footprint possibly a millennium years old, imprinted on a sandstone

---

[53] The question of visit of Saint Thomas to the city of Taxila, conversion of Gondophares, the king of Taxila to Christianity, The Grave of Christ (*Hazrat Eisa*) in Kashmir and the presence of Jews among the Pakhtuns in KPK Province and in Kashmir has attracted the attention of several scholars - each with his/her own specific interest in view.

[54] Father John Rooney and Christine M. Amjad Ali.

[55] Dr. Ahmad Hasan Dani and Dr. Saifur Rahaman Dar.

[56] John Rooney (Editor), St. Thomas and Taxila. Rawalpindi, 1988. This document includes two papers one each by Dr. Dani (PP. 10-15) and Dr Dar (PP.16-31). In the Proceedings of this Seminar, Fr. John Rooney, the Editor "….confessed himself completely bowled over by the sheer details of Dr. Dar's presentation". P. 31

[57] Dr Dani and Suzanne Olsson did this small excavation at Murree. The news was published in national newspapers of Pakistan. Late Dr. Muhammad Saleem, once an assistant of Dr. Dani also confirmed it to me. The small cemented structure was locally known as *Mai Mari ki Marhi* (مائی مری کی مڑھی) i-e the sitting place of the goddess of smallpox (editor).

near Margalla hills, north of Islamabad". Like Joffee's previous claim about Mary's Grave in Murree, in this case too I do nor t know the source of his information. From my part I express my ignorance of this discovery. To the best of my knowledge, Dr. Dani did not publish any book or article after 2000.[58] If anybody knows anything about these two discoveries, please let me know.

In the city of Islamabad Dr. Dani spent the last 38 years (1971-2009) of his life and it was here that he lies buried eternally. This is the city where he stayed for the longest period of his life. This period includes 29 years of his retired life. But retired he was only from his service but not from his pursuits. which kept him busy till the last days of his life. It was the longest phase of his professional life. To me, the real worth of Dr. Dani was revealed to, and acknowledged by the world during the days he spent in Islamabad.

Dani's achievements during his post-retirement period are more extensive, enriched and varied than the earlier phases of his life - though in no way less in significance. His contributions during this period can be highlighted in three sub-phases. namely:

Phase IV-a

After his retirement, Q. A. University appointed him as Professor Emeritus and allowed him to retain his office and all of its facilities. This enabled him to continue his supervision of research by PhD students and also kept him engaged in the affairs of Taxila Institute of Asian Civilizations as its Honorary Director. This post he held till his death. He also retained his post of Honorary Director of the Center for the Study of Civilizations of Central Asia in the same University till 1997. Side by side in the same year (1980) he was appointed as the Co-Director of The Pak-German Team for Ethnographical Research in Northern Areas of Pakistan along with Prof. Karl Jettmar from Heidelberg University as his counterpart from Germany. Simultaneously, he was also engaged by UNESCO from 1980 onward, particularly during Silk Road Expeditions, and also as member of the Team for writing History of Central Asian Civilizations in four volumes. I was fortunate to be the co-author (along with G. A. Pugachenkova of Russia, M. A. Joyenda of Afghanistan and R. C. Sharma from India) of an article on Gandhara Art for Volume II (1994) of the series.

Phase IV-b

His greatest contribution towards archaeology, history and heritage of Northern Areas of Pakistan in particular and heritage of Pakistan in general coincides with this phase of his life. By now Dani's romance with Gandharan studies was almost over his entire attention was now diverted towards Northern Areas for divulging secrets of its history. And his articles and books about this region started appearing one after another unraveling its secrets. This was the rediscovery of history and heritage of Northern Areas of Pakistan. Before 1970's the Karakorum Highway was not yet ready and hence the whole of the Northern Areas was practically a "no-go-area" particularly for foreigners and local archaeologists. Very few people had any idea about the people, history and culture of this area. As already explained above, in 1979 and afterwards the German-funded Team headed jointly by Dani and Jettmar, probed the area for the purpose of ethnographical, archaeological and epigraphical investigations of Northern Areas during the coming five years through their studies of monuments, epigraphs, pictographs, as well as oral traditions. The mission was entirely funded by the German Team. This mission turned out to be a life-long pursuit with tremendous success. Within a few years a whole vista of human record that was found carved along the rocks and

[58]. See for example Khan 2009, pp.263-264 (Books and Monographs) and pp. 264-270 (Articles).

boulders - all along the Indus River from Skardu down to Besham was unveiled to a great surprise of the whole world. Books such as **Karakorum Highway unravels the Romance of the Past** (1982), **Human Records on Karakorum Highway** (1983), **Chilas - The City of Nangaparvat** (1983), **Guide to Karakorum Highway** (1983), **Islamic *Architecture* - The Wooden Style of Northern Pakistan** (1989), **Sacred Rock of Hunza** (1989), **History of Northern Areas of Pakistan** (1989) etc, poured in the market in quick succession one after the other[59]. Another achievement of Dani was to organize in Gilgit in 1983 the ever-first International Conference on Karakorum Culture and for the first time foreigners were allowed to travel along the newly completed Karakorum Highway from Islamabad to Khunjerab Pass on China's border. Dr. Dani was the Chairman of the Conference and I was lucky enough to attend this Conference and visited the Northern Areas for the first time.

Phase IV-c

Apart from his busy schedule in Northern Areas, Dani also remained pre-occupied with his services rendered to UNESCO in more than one way. But what interests us more during this period is his services with regard to organizing several international expeditions in connection with revisiting the Ancient Silk Road through various countries. both through land routes and sea. The longest expedition was through five Central Asian Republics which were till then still part of the USSR. Dr. Dani was the Scientific Leader of this Expedition. It was a huge expedition comprising more than one hundred members from all over the world moving in one group by road from Nysa in Turkmenistan in the West to Khargosh on Kazakastan-China border in the east travelling across the formidable snowy mountains of Pamir and Hindukush and burning deserts of Karakorum and Kyzyl-Kum. I was again fortunate for being part of this Expedition and observing very closely Dr Dani as an explorer, as a scholars and as a leader of an international team of experts comprising representatives from countries extending from USA to Japan and Korea for a little over two months (19th April-18th June, 1991) excluding our (me and Dr. Dani) stay in Moscow on our way to and from Central Asia). This provided me an excellent opportunity to know Dani from very close. A similar opportunity to travel with Dr. Dani was provided to me during Silk Road Expedition through Nepal a few years after the Russian expedition.

Through these expeditions, I realized that Dr. Dani was known more and better in Central Asia than, perhaps, in Pakistan. Similarly, during my several official visits to India and through meetings with several important and well-known archaeologists in that country I came to realize that Dani is respected there among scholars better than in his own country - especially for his knowledge of Sanskrit and expertise of ancient Indian paleography. He was equally respected by his colleagues and students of Dacca University. The students and teachers alike tried their best to halt his departure from Dacca in 1961. This respect was not merely for his being a teacher but also as an author of several books on Bengal history, architecture and archaeology of whole Bengal - but particularly East Bengal - the East Pakistan of those days.[60]

During the same post-retirement period, Dani also was the Co-Editor (with V. M. Masson) of: History of the Civilizations of Central Asia Vol. I - The Dawn of Civilizations (1982) and Editor of: The Scientific And

[59] Besides, during the same period, Dani also published several other works of equal importance such as **Historic City of Taxila** (1986), **Islamic Architecture of Thatta** (1981), **Recent Archaeological Discoveries in Pakistan** (1988), **Timur's Legacy** (1996), **Romance of the Khyber Pass** (1997, etc.

[60]. See M. Mamoon, 1991.

Cultural History Of Mankind, Vol. II (UNESCO, 1990-95) and Co-Editor of The Scientific And Cultural History Of Mankind, Vol. I (UNESCO, 1983-93).

People of Peshawar and Islamabad owe Dani a lot

People of Peshawar and especially of Islamabad will remember Dr. Dani for a long time to come for his efforts in creating awareness in them about the rich and long history of their territories. The members of foreign missions working in Islamabad and high gentry living in this city will ever remain obliged to him for arranging several cultural caravans to different cultural and historical places in close proximity of the capital where he used to take them periodically and personally briefed them the history and significance of the sites they were visiting. Majority of the foreigners living in Islamabad were introduced to the rich cultural heritage of this country through the academic generosity of Dr. Dani. I wish there should be someone in these cities who should write of eulogy of Dr. Dani highlighting his services for these cities as Mustanssir Mamoon did in favour of his services for the city of Dacca.[61]

Qualities of his head and heart

For the excellent success in his life, Dani gave credit to his God-given extraordinary memory, hard work and habit of continuous reading and writing and his amiable social behaviour with all and sundry. But he had also an extraordinary potentials of sharp intelligence, great capacity to analyze problems and find their solutions. It was his habit to oppose a solution offered by others and hence generate a lively discussion before reaching a final solution.

Genius like Dani are born only once in a blue moon

Men with the genius of Dani are born only once in a blue moon. He was a scholar of many dimensions and great depth. He was fluent in writing and was consistent in his views and arguments. He had immense confidence in what he wrote and what he expressed. I remember two incidences of this nature. Once a journalist approached him and requested for an article for his paper on some specific topic. Dr. Dani asked the journalist to have a chat with me while he wrote for him. Within a short time he handed over a few freshly handwritten pages and the guest went away fully satisfied. I dared ask Dr. Dani how it happened that he had not bothered even to cast a second glance over what he had written. He smiled in his characteristic way and told me that it has never been his habit. Re-reading with a purpose of checking mistakes often results into revision and rewriting and that he never liked. At another occasion in a Conference in Alma Ata, Kazakhstan, I was sitting next to Dr. Dani. A speaker started reading his paper. Dani listened to the speaker for a few minutes and then snoozed for rest of the time. When the paper ended, Dr. Dani woke up and started criticizing the paper point by point. It was a bit of a surprise for me. Later on I asked him as to how did he know all those points when he was snoozing all that time. He smiled and said that for understanding what a writer or speaker intends to say it was sufficient for him to listen the speaker carefully only for the first few minutes. "Then, I know what he is going to say in rest of his speech or paper", said Dr. Dani. This was the man behind Dr. Dani whom I tried to understand during my acquaintance with him during 47 years of my life. His eyes were always smiling and his mind always busy in finding new meanings of things around him. With his departure we have certainly lost a great genius of our age whose contributions in the field of archaeology and epigraphy of Pakistan are

[61] . See: Mamoon 1991.

lauded at international level. Allama Iqbal has rightly said about such outstanding personalities:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

Hazaron saal nargis apni bai-noori pai roti hai
Barri mushkal sai hota hay chaman mein deeda-war paida.

God may bless his soul and grant him eternal peace in heaven.

Dani has not only made many discoveries in the field of archaeology, he proved to be an instrument in starting teaching archaeology in Pakistani and above all he popularized it among masses - elites and commoners alike.[62].

Dani's siblings

Dr Dani in his autobiography has talked quite at length about his ancestors and somewhat economically about his cousin-wife but strangely he talks very little about his own children[63] Dr. Dani's eldest son Dr. Anis Dani in his interview, published in 1991[64] when Dani has already been retired for almost eleven years, talks about his father's career up till 1947 only and no more. Ahmad Hasan Dani breathed his last on Monday, 26th January. He was 89 years old. He has left behind him his widow, one daughter, three sons and a number of grandsons and granddaughters. He was unlucky not to see his second great grand daughter who was born the day he died).

****

[62] Khan and Shaheen 2015.(Ahmad Hasan Dani's Popularization of History, Archaeology").
[63] Dani spares hardly 15 line of his biography under the title: *Aulad* i.e. His Children (See: ***Dani ki Kahani***, p. 168).
[64] Dani 1991, p.10.)

References for further reading

Anonymous "Bio Data of Professor Ahmad Hasan Dani". In: Pakistan Archaeology Number 26, Karachi, pp.11-28.

Awards List Award List for Ahmad Hasan Dani on heritage govt. pk. website. Retrieved on 30th April 2020.

Bing. "Ahmad Hasan Dani - A Profile". Down loaded on 18th Feb. 2021.
*https//www.bing.com.
Daily Express 2009 Daily Express (Urdu), Special Edition, January 27, 2009.

Dani. 2011 Ahmad Hasan Dani, *Dani ki Kahani - Dani ki Zabani - Dr. Ahmad Hasan Dani ki Dastan-i-Hayat.* Sang-e-Meel, Lahore,2011.

Dani 1991 Anis Dani, "The Making of the Man". Pakistan Archaeology Number 26, Karachi, pp.4-10.(Based on an Interview of Dr. Dani given to his son Dr. Anis Dani in January 1990.

Dar 2009 Dr. Saifur Rahman Dar, "Professor Ahmad Hasan Dani. A Tribute". Daily Friday Times, 22 Feb. 2009.

East and West,Journal, Rome. An Obituary Note on Ahmad Hasan Dani (cf. Muzaffar Ahmad, AASAAR, Vo. I, No.2,2020, pp. 26).

Hussain, Farah. "A Morning with Farah - Ahmad Hasan Dani and His Wife's Live Interview on Pakistan Television. Retrieved on 4th September 2009.

Joffe 2009 Lawrence Joffe, "Obituary Note: Dr. Ahmad Hasan Dani: "Pakistan's leading archaeologist and an authority on South and Central Asian archaeology and history", The Guardian, Tuesday 31 Mar 2009. Retrieved on 29 -04-2020.

Khan 1998 Omar Khan, An Interview with Ahmad Hasan Dani on HARAPPA.Com website in Islamabad on 6th Jan. 1998.

Khan 2009 Gul Rahim Khan, "In Memory of Professor Ahmad Hasan Dani-His Services, Contribution and Achievements", Ancient Pakistan, Number XX, 2009, pp. 261-272.

Khan & Shaheen 2015 Rafiullah Khan & Ifqut Saheen, "Ahmad Hasan Dani's Popularization of History, Archaeology. Its Praxas, Context and Outcomes". Journal of Asian Civilizations, Vol. 38, no.1, 2015, pp. 107-130.

Khan 2018 Rafiullah Khan, "Remembering the Iconic Dani", Daily the News (on Sunday), January 2021.
Khan 2020 M. Nauman Khan, "Profile of Ahmad Hasan Dani", On Salaam website. Retrieved on 30th April 2020.

Mamoon 1991 Mustanssir Mamoon, "Professor Ahmad Hasan Dani and the City of Dhaka". An Interview given by Prof. Dani to Mustanssir Mamoon in 1988. Pakistan Archaeology, Number 26, Karachi, pp. 25-57.

Nadiem, 1993 Ihsan H. Nadiem, "Dani - The Man behind the Scholar", Lahore Museum Bulletin, Vol. VI, Nos. 1-2, Jan.-Dec., 1993, pp.1-16.

Sehrai 2009 Fida Ullah Sehrai, "Ahmad Hasan Dani - Funeral Report". On Youtube.

Shaeen 2017 Dr. Ifqut Shaheen, "Civilizational Ideal: Exploring Professor Ahmad Hasan Dani's Approach to the Study of History and Understanding of Civilizations". Daily The News (on Sunday), Lahore, January 22, 2017.

Shahid 2015 Natasha Shahid, "Ahmad Hasan Danni's Profile". The Friday Times, 7th August 2015. Also see Who o is Who: Archaeology in Pakistan. Retrieved on 30th April 2020.

The Times 2009 Obituary Professor Ahmad Hasan Dani - Archaeologist", 18th Feb. 2009. Retrieved on 29th April 2020.

Zahir & Hobaib 2021 Dr. Muhammad Zahir & Hobaib Muhammad, "Pakistan through the Ages by Dani written on 29th January 1949)". In: AASAAR, Vol.I, No.2, pp. 1-10.

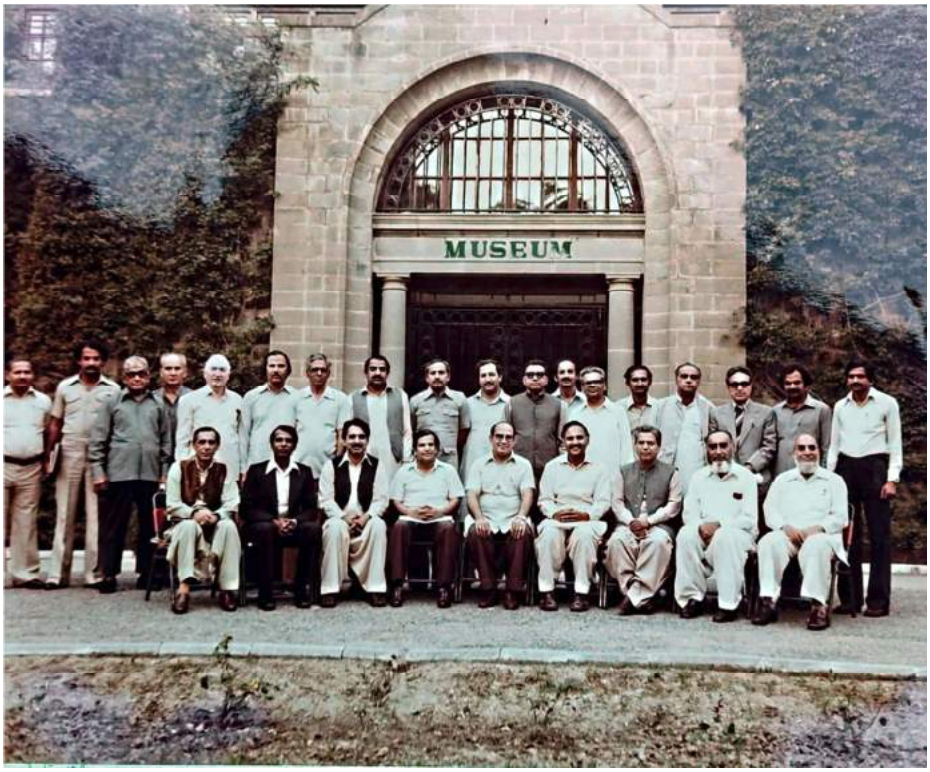

1982. Nine ex- curators of Taxila Museums - all seated in front row, be seniors like Dr. Khan, Dr. Dani, Sh Khurshid Hasan, Dr. Farzand Durrani, prof F U. Sehrai, etc. All standing behind them.

1982. A rare photograph of Archaeologists of Pakistan seen in Front of Taxila Museum. Picture includes senior archaeologists such as Dr F.A. Khan, Dr. A H. Dani, Wali Allah Khan, Fazal Qadir, Prof. F.A.Durrani, Prof zF. U. Sehrai, M.I. Khan, A M Lindkhwar and Dr. S R Dar - all seated.

Participants of the Course on Museology in Lahore Fort, Lahore seen with some of the course teachers seated on chairs are:from L. to R. Dr. M Sharif , prof. F. A. Durrani, M.I. Khan Dr. Dani and Dr S R Dar**.**

1993, Lahore. Dr. Dani among the participants of Seminar on Historical Research in Pakistan.

1977.Dr. Dani seen with Dr.S.R. Dar, Dr. Ishtiaq Khan and Dr. Ahmad Nabi Khan

1977.Dr. Dani in the office of director Lahore with Dr. Dar and others

Dr. Dani delivering a lecture at Lahore Museum.

Dr. Dani and Mr. B.A. Kureshi and Dr. Dar discussing some matter during Museology Training Programme in 1981.

Dr. Dani! wearing hat among the participants of Cultural Caravan from Islamabad.

Centenary Lahore Museum 1894-1994. Dr. Dani in centre

1994. During a dinner in Lahore. In the picture are,: Dr. Dani, Dr. Dar and Secretary Culture Punjab.

1995. Inaugural Ceremony of International Training Workshop of Development and Promotion of Museums held in Lahore Fort. Seen In the picture are: Mrs. Shanaz Shaikh, Secretary Culture ‹Dr. Dani, Dr. Dar, Dr. Mughal Dr. Englehard (UNESCO) and Dr. Ishtiaq Khan.

1994. Participants of Lahore Museum Centenary Celebration. Dr. Dani is seen in the Center with Dr.Dar on his left.

Dr. Dani delivering a lecture in Lahore Museum.

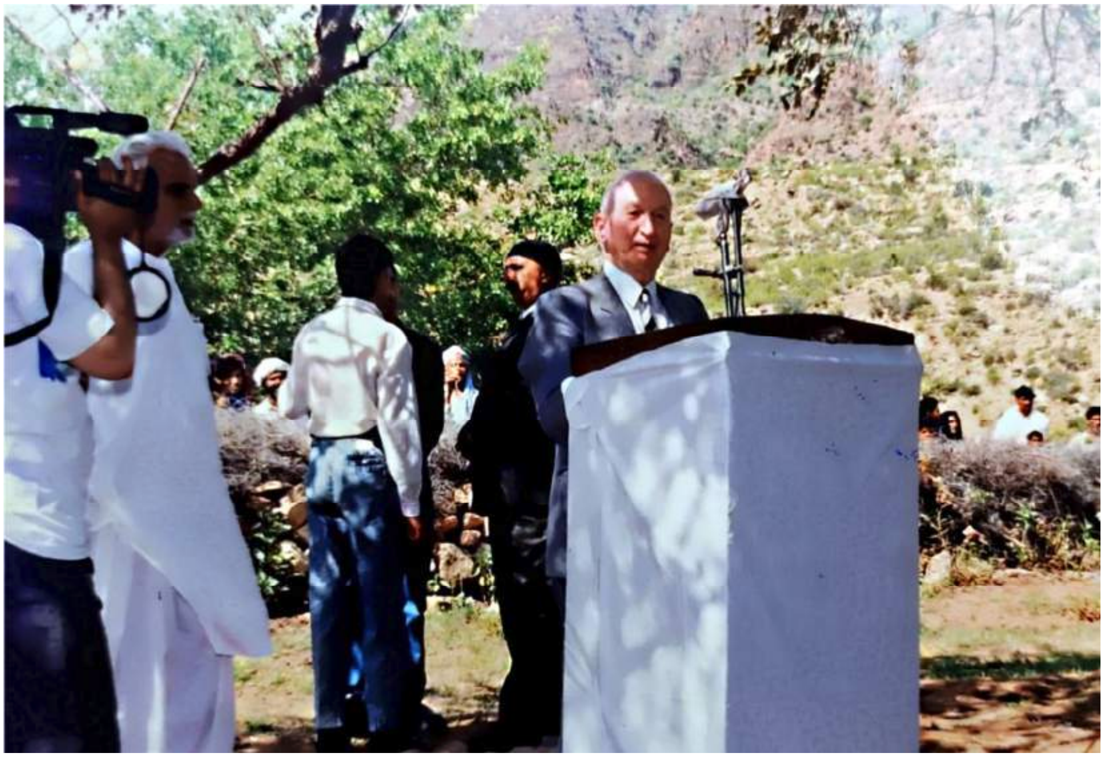

1997. Nandana Fort.Dr. Dani delivering lecture to the members of the Cultural Caravan from Islamabad.

1976. During an exhibition in Lahore Museum.Dr. Dani can be seen between Dr. Zawwar Hussain Zaidi (left) and Dr. Dar right).

Dr. Dani conducting a delegation from Tajikistan. Also seen in the pictures are Dr. S R; Dar, Dir. Lahore Museum and Dr. M Sharif, Dir. Archaeology, Lahore Fort.

1981.Dr. Dani, Mr. BA Kureshi and Dr. Dar during the Museology Training Course in Lahore Museum.

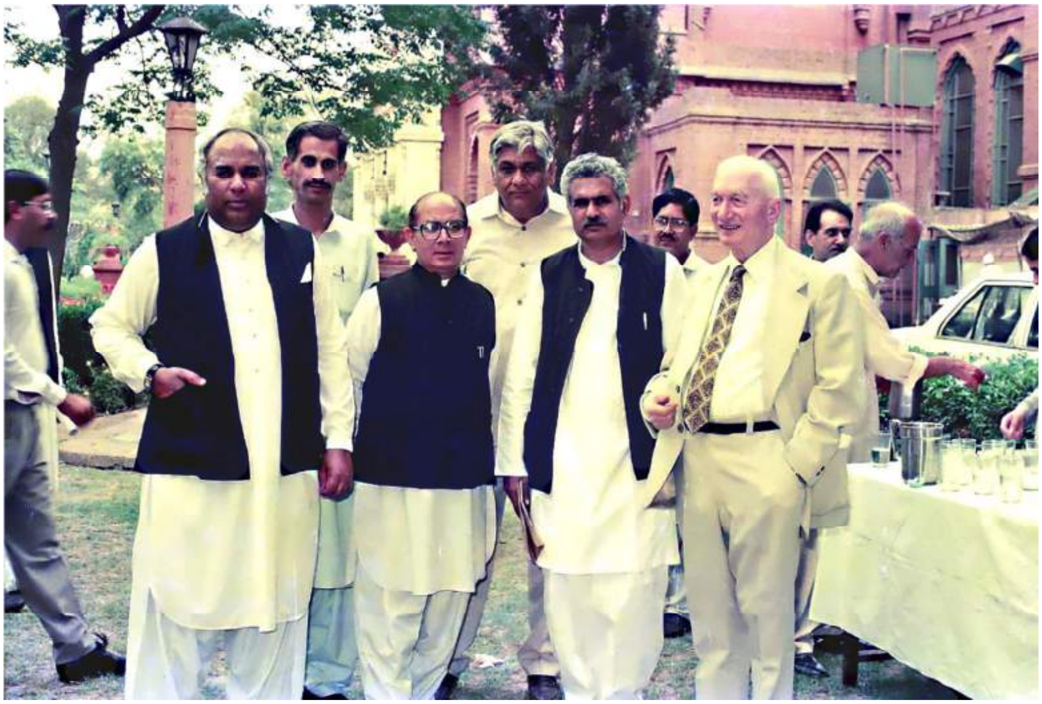

Dr. Dani with Dr. Dar, Rafique Dogar and Afzal Khan. In the background can be seen Talib Hussain, I.H.Nadiem, prof. Fidaullah Sehrai, Masud ul Hasan Khokhar and Mr. Sahu. The picture was taken in front of Lahore Museum In early 1990's.

****

Context of Moulded Pottery from Depar Ghangro: A Buddhist Site in Sindh

Mohammad Rafique Mughal

ARTICLE INFO **ABSTRACT**

Keywords:
Kushan
Buddhism
Mansurah
Brahmanabad
Cousens
Stupa
Excavations

In Sindh, Buddhism flourished under the Kushans between the first and third centuries CE and had two Buddhist rulers in the 6th to the middle of 7th centuries. Several religious and settlement remains of this period have survived at various places. One of the Buddhist sites was Depar Ghangro near Mansurah which was briefly explored about a century ago. The site yielded pottery of distinctive shape and decoration in relief on the outer surface produced with pottery moulds which can now be compared with that found at other sites in Sindh. Its chronological and cultural significance is assessed in this brief paper.

کلیدی الفاظ:
کشان
بدھ مت
منصورہ
برہمن آباد
کوسنز
آثاریاتی کھدائیاں

خلاصہ: سندھ میں بدھ مت کا فروغ کشان عہد میں پہلی سے تیسری صدی عیسوی کے درمیان ہوا اور چھٹی سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے وسط تک دو بدھ مت کے پیرو حکمران بھی سندھ میں گزرے۔ اس دور کے کئی آثاریتی مقامات مختلف جگہوں پر وقت کی دست برد سے بچ پائے ہیں۔ دیپر گھانگرو بھی ایک ایسا ہی مقام ہے جس پر ایک صدی قبل کچھ کھوج کا کام ہوا۔ یہاں سے ایک مخصوص شکل اور بیرونی سطح پر ٹھپوں کی مدد سے بنائی گئی ابھرواں سجاوٹ کی حامل کی ظروفی روایت دستیاب ہوئی جس کا اب سندھ میں دوسرے آثاریاتی مقامات سے ملنے والے ظروف سے تقابل کیا جاسکتا ہے۔ اس مختصر تحقیقی مضمون میں اس کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

Depar Ghangro (Dipal Kangara or Dipal Gangara) is located about six miles northeast of the ruins of Mansurah,[1] an Islamic site also known as Brahmanabad in Sanghar district of central Sindh (Fig.1). The site was reported by the Europeans during the middle of 19th and early 20th centuries[2]. Henry Cousens who dug several trenches at Mansurah also investigated Depar Ghangro and identified it with a Buddhist stupa built of large sized bricks set in mud mortar (1929: 59). In 1966, Dr. F. A. Khan initiated diggings at Mansurah[3] which continued with intervals until 1998 by his successors but Depar Ghangro was not investigated even though it is aligned with other Buddhist stupas in Sindh known at Jerrak, Mirpur Khas, Thul Mir Rukhan and Tando Muhammad Khan.

Cousens dug through the Buddhist stupa which was built of a large sized (burnt) bricks and mud mortar with sun-dried brick core. In the settlement area, he noted "several lapidaries houses" from where he collected several "basketful of chips" of all kinds and sizes of stone unfinished and drilled, some showing "white pigment" (actually etched). In addition, he noted presences of shells of many shapes and sizes, "quantities of shell bangles," plain and incised and unworked ivory pieces stored in a room. There is no description of structural remains of the habitation area. There is also not much information published on ceramics found at Depar Ghangro with an exception of discovery of four fragmentary pots or "goblets," one of which was partially restored and illustrated (Cousens 1929: Fig. 5, p.53). The external surface of the pot is covered with "raised" designs produced with pottery mould (Fig.2). One pottery mould was also found indicating local production of such pottery.

The technique used to produce the moulded surface on the four fragmentary moulded pots as found at the Depar Ghangro recalls parallels with identical vessels found from the pre-Islamic levels of the Banbhore, a port city in Sindh (Fig.

3). At Banbhore, a site mostly contemporary with Mansurah the moulded pottery is assigned to Period III or Brahmanical and Buddhist Period of 7^{th} and early 8^{th} century CE as shown below.

Period-V	Abbasid (Late Islamic)	751-1011 CE. Late 8^{th} to 11^{th} centuries CE and later until about 12th century
Period-IV	Umayyad (Early Islamic)	669/711-750 CE. First half of 8^{th} century CE
Period-III	Brahmanical and Buddhist	641-712 CE. Brahman dynasty of 7^{th}-8^{th} centuries CE. 499-641 CE. Rai dynasty 6^{TH}-7^{TH} centuries CE
Period-II	Sasanian	302-445 CE or later
Period-I	Scytho-Parthian	Circa first century BCE to 2^{nd} century CE or later

Chronology of Banbhore-M. R. Mughal

The recent excavations carried out at Mansurah in 2021[4] have revealed new information from what may be recorded as the early levels of Mansurah, the first Arab capital in Sindh. The evidence is significant because of its relevance to the early history and location of pre- Islamic city of Brahmanabad and founding of a new city called Al-Mansurah. The new evidence consists of red wares without painting but depicting many designs in relief made with pottery mould showing male and female figures mostly in dancing postures. Some figures seem to represent symbolic rituals related to perhaps religious ceremony. All such designs on pottery are shown in relief which are made with help of pottery mould. The moulded designs also include stylized human figures shown within a circle that decorate the external surface of pottery (Fig. 4). Some motifs seem have been stamped when the clay was still wet. The is no glazed or imported pottery reported from the levels containing moulded and stamped pottery.

The moulded pottery discovered recently from Mansurah seems to have come from the settlement area of the pre-Muslim period, assignable mostly to Buddhist-Brahmanical period ceramic tradition. The evidence is significant in any discussion on the identification and location of site Brahmanabad and Mansurah (Cousens 1929: 66; Pathan 1974: 65-79 and 1978: 249-258). A general consensus supported with extensive bibliographical references is that the newly founded city of Mansurah (circa 130 AH/ 754 CE), incorporated some parts, if not the entire area of the pre-existing city of pre-Muslim period called Brahmanabad or Brahmanabad. It has become evident that the old and pre- existing city was enlarged by the Arabs and protected with burnt brick fortification wall and further strengthened with bastions. The moulded pottery at Mansurah belongs to the same category of moulded ceramics which were reported by Cousens from Depar Ghangro and in the pre-Islamic levels at Banbhore. It is possible to suggest that the ceramics with moulded surface and associated bichrome painted pottery (not discussed in the present context) were wide-spread in lower Sindh during the Buddhist-Brahmanical period before the Islamic times. This ceramic tradition persisted for some time in the Islamic period until replaced by different pottery forms and decorative designs so well represented at the cities of Banbhore and Mansurah.

****

Notes

1. Map of H. Cousens (1929, Pl. V) shows its location at northeast of Mansurah instead of North-West.

2. By Bellasis and Richardson as published in the *Illustrated London News*, February 21, 1857 and by Henry Cousens in *Progress Reports of the Archaeological Survey of India, Western Circle* for the years 1895-96; 1896-97 and 1908-09; and *Annual Report of the Archaeological Survey of India* 1903-04 and 1908-09. Cousens published a comprehensive account in *Antiquities of Sind (1929): 48-71.*

3. *Pakistan Archaeology* (1968); A. N. Khan (1990); Farooq (1974-1986); Masih (1993; Mughal (1998) and Qasim (2000).

4. The excavations were carried out by Dr. Ghulam Mohiuddin Veesar, former Chairman of the Department of Archaeology and Anthropology, Shah Abdul Latif University at Khairpur under the general supervision of former Vice Chancellor and archaeologist, Dr. Nilofer Sheikh. The writer is thankful to Dr. Veesar for generously allowing publication of photographs of moulded pottery discovered by him.

Bibliographical references

Cousens, Henry (1929)
Antiquities of Sindh. Archaeological Survey of India, Volume 46, Calcutta. (reprinted 1975 and 1998)

Farooq, Abdul Aziz (1974- 1986)
Excavations at Mansurah (13th Season), *Pakistan Archaeology*, Nos. 10-22: 3-35.

Khan, Ahmad Nabi (1990)
AL-Mansurah. A Forgotten Arab Metropolis in Pakistan: Karachi: Department of Archaeology & Museum, Government of Pakistan: 32-41.

Khan, F.A (1968)
Mansurah, *Pakistan Archaeology,* No.5. Karachi: Department of Archaeology, Ministry of Education, Government of Pakistan: 186-202.

Masih, Farzand (1993)
Preliminary Report of Sector IV: Excavation at Mansura 1986-87, *Ancient Pakistan*, Volume VIII. Professor A. H. Dani Felicitation Volume: 1-10.

Mughal, Mohammad Rafique (1998)
Mansurah. In, *The Archaeology of Sindh (since 1930*): Supplement to *the Antiquities of Sind.* Third Edition. Karachi: Department of Culture and Tourism, Government of Sindh: 161-164.

Qasim, Qasim Ali (2000)
Archaeological Excavations at Mansurah (15th Season 1997-98), *Lahore Museum Bulletin,* Vol. XIII, No. 1: 1-19.

Pathan, Mumtaz Husain (1974)
Arab Kingdom of Al-Mansurah in Sind. Institute of Sindhology, University of Sind. Sind.

Pathan, Mumtaz Husain (1978)
Sind: Arab Period. History of Sind Series, Volume 3. Hyderabad (Sind): Sindhi Adbi Board:245-280.

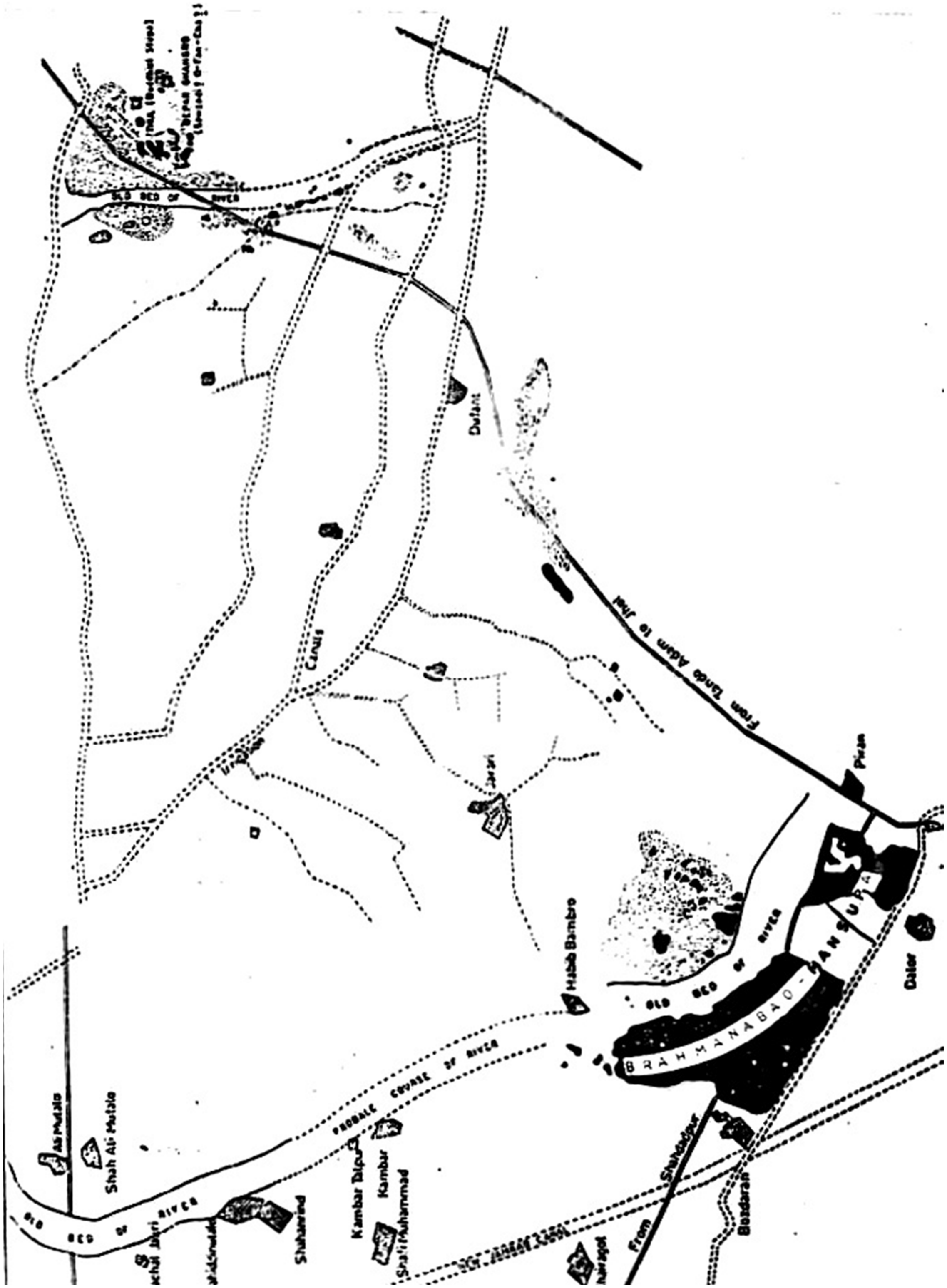

Fig. 1: H. Cousens' map of Mansurah and Depar Ghangro with traces of ancient remains indicated by potsherds and bricks as recorded in 1929.

Fig. 2: Pedestal-footed pot decorated with moulded designs in relief from Depar Ghangro (reproduced from Cousens 1929: 53).

Fig. 3: Restored pedestalled pot showing designs in relief on external surface produced with pottery moulds from Banbhore dated to the Brahmanical-Buddhist Period III of 6^{th}- 7^{th} centuries CE.

Fig. 4. Potsherds with moulded designs found in the “early” levels of Mansurah in 2021 by Dr. G. M. Veesar.

A study of Buddha Image in the Light of Early Buddhist Texts

Dr. Tahir Saeed*

ARTICLE INFO **ABSTRACT**

Keywords:
Buddha image, Buddhist texts, making of Buddha image, development of Buddha image, Gandhara, Mathura

This paper presents an investigation about the origin and development of Buddha image. The topic is presented in six parts: first part presents introduction to the early Buddhist texts on the prohibition of Buddha image; second part provides information on the Buddhist texts on the making of the Buddha image; third about the sources regarding the making of Buddha images after the Nirvana of the Buddha; fourth about the details of image of the Buddha during the Asokan period; fifth part provide details about the purpose of making the early images of the Buddha; sixth deals with the development of Buddha images in Gandhāra during the period from 2nd - 1st century BCE to 5th Century CE.

کلیدی الفاظ:
بدھ صورت
بدھ متون
بدھ صورت گری
بدھ صورت گری کا ارتقاء
گندبارا
متھرا

خلاصہ: درج ذیل تحقیقی مضمون میں بدھ کی صورت گری کے آغاز اور ارتقاء کے بارے میں تحقیق پیش کرتا ہے۔ یہاں اس مضمون کا احاطہ چھ حصوں میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ بدھ کی صورت گری کی ممانعت پر ابتدائی بدھ متون کا تعارف پیش کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں ان متون کا تذکرہ ہے جو بدھ کی صورت گری پر مواد پیش کرتے ہیں۔ تیسرا حصہ ان ماخذوں کا ذکر کرتا ہے جو بدھ کے نروان کے بعد بدھ کی صورت گری پر بات کرتے ہیں۔ چوتھا حصہ کشان دور میں بدھ کی صورت گری کے تعلق میں ہے۔ پانچویں حصے میں بدھا کی ابتدائی صورت گری کے مقاصد اور چھٹے حصے میں پہلی اور دوسری صدی سے لے کر پانچویں صدی تک بدھ صورت گری میں ترقی و تبدیلی کا تذکرہ ہے۔

*Deputy Director, Department of Archaeology and \museums, Islamabad

Buddhist texts on the prohibition of Buddha image:

The Buddhist artists began very early to represent not only figures of Buddha, Bodhisattva and other Buddhist teachers and saints, but also episodes from the series of his former incarnations, the stories of which are told in the *Jatakas* (Oldenburg & Wiener 1897: 183). About the image of Buddha, C. Sivaramamurti has mentioned in the following words:

> "North Western India has been a meeting place of many cultures, and the influences of the Greeks the wake of Alexander's invasion has left a permanent impress on the sculpture in this area. The Greeks were superseded by the Scythians who in their turn with overcome by the Kushanas all to a greater or less extend in touch with Western art. The anatomy of the figures, the arrangement of drapery, the treatment of hair, the poses and attitudes of the figures all suggest this influences. The earliest representation of Buddha in human form which comes from the Gandhara are depicts him almost as a Greek youth (Sivaramamurti 1954: 6)".

According to J. C Huntington, Alfred Foucher has cited two passages from the *Mahaparinibhana suttana,* the first passage is about the continuation of the order and the succession of the teachings, while the second passage is about the cessation of life (Huntington 1985: 23). In all Buddhist literatures, the scholars have only been able to locate one reference up a specific. This occurs in the *Vinaya* of the *Sarvastivadins*. Huntington further mentions that in a chapter dealing with the decoration of monasteries, the Buddha is asked by Anathapindaka, *"Word honored one, if images of yours are not allowed to be made, pray may we not at least make images of Bodhisattvas in attendance upon you?"* The

Buddha then grants permission to the request. Although the text was not translated into Chinese until 404 CE, Waley suggests that this passage must reflect an early layer, at least of the first century C.E. However, Lamotte points out that the *vinaya* of the *Mahasamghika* and that of the Dharmaguptaka sects specifically allows the decoration of stupas and monasteries with paintings of devas (deity), monks, dragons, animals and landscapes, but both are silent on the subject of an image of the Buddha. This absence of from these vinayas may be seen in any of at least three ways first, that representation of the Buddha was so commonplace that there was no need to discuss, second that it just was not done and that there was no need to mention it, or third that images of the Buddha were indeed made but that they would not have been mentioned as "decoration" since they were not appropriate to the decorative context but were cult or commemorative images of great sacredness (Huntington 1985: 27).

Texts on the production of Buddha image:

The Korean Buddhist Canon number 281, *Tso fo hsiang hsiang ching, (Tathāgatha pratibimbapratisthānusamsasutra),* "Buddha spoken Buddha-image making sutra", is one of a number of Chinese translation of a detailed account of the measurements and proportions of Buddha images. These translations are all more or less closely related and in quite close agreement on the proportions. In his note on the Buddha's image, Waley also cites the vinaya of the Mula Sarvastivadins as stating that when "Anathapindaka asks if it is permissible to make images of the Buddha's earthly semblance", he is told that there is no objection. This text was translated in 170 C.E and is further strong evidence of an early tradition of images (Huntington 1985: 31).

Buddha images after the Nirvana of the Buddha:

According to John C. Huntington, Winternitz in his *History of Indian Literature* had dated the earliest layers of the *Saddharma-pundarika* to the first century CE. Further, Hurvitz in his translation of his important text, while addressing the problem of the age of the text, suggest, in agreement with Winternitz that it is the verse layers of the text that are the earliest. Within the passage, there is a definite indication of how the image must look. Twice, the marks of the Buddha are mentioned once as "carvings perfecting the multitudinous marks" and "adoring them with marks of hundredfold merit". These cannot be taken as other than the thirty-two major and eighty minor marks of the Buddha which is well known from the earliest Buddhist literature. This author further elaborates that from the evidence of the nun-specific but obvious acceptance of images in the *Saddharma-pundarika,* the accounts of the Maha Bodhi image and the narrative of informing Ajatasatru of the death of Buddha, one would have to state that there is a very strong tradition pointing to the making and use of images in the period immediately following the death of the Buddha. Another text that refers to early image making is the *Astsāhasrikā prajnapāramita*. It too contains a general incidental reference to the making of images after the death of the Buddha (Huntington 1985: 43).

Buddha images during the Asokan Period:

Huntington quotes that Taranātha's "*History of Buddhism in India"* contained material from an independent version of the Asoka legends, mentions two images in the account of the events during Asoka's reign and the events of Asoka's life. The first is an image which Asoka saw during the process of his conversion. The second is an image given by a merchant to the teacher of the king of the island of Simhala. As regard the geographical progression of image making of Buddha is concerned, it is mentioned by J.C Huntington that the locations of the early images also follow a geographical / chronological progression out of Māgadha through Kausāmbi to Mathurā. Further, the one tradition to which the origin of the Buddha image has heretofore been ascribed by art historian, that of the Sarvāstivādins of Mathurā, is known to have had a proscription against the making of images which must have lasted until about 100 BCE, when the stylistic evidence demonstrated that they began making images of the Buddha along the times of Sunga period *yaksa* figures. Hence the tradition of making images and the image conventions themselves may be seen to follow the same pattern as the literature of the early period of Buddhism (Huntington 1985: 46).

Early images of Buddha:

Nirmal C. Sinha describes that in *Samyutta Nikaya*, also *Majjhima Nikaya* is related the story of disciple Vakkali who in his deathbed was most eager to see Buddha in person. Buddha came to him and said *"O Vakkali why you crave to have like at this body of impure matter. Vakkali one who perceives Dhamma perceives me. One who perceives me perceives Dhamma"*. In the same Nikayas, Buddha is on record thus *"One who perceives Pratityasamutpada, perceives Dharma; one who perceives Dharma, perceives Pratityasamutpada"*. In short Buddha said that his Teachings were important and not his Kaya (body). It was an injunction against adoration of the Master's image, this is, Buddha Rupa or image of Buddha (Sinha 1987: 21).

Development of Buddha image:

The art of sculpture making was started from the 7th century BCE in Greece and passed through different phases of development and reached to the classical period which was the climax of Greek art and then entered into the Hellenistic phase. In this phase infusion and diffusion on art was started. The period between the end of 5th century BCE and 480 BCE is known as classical period. The art of this period was dominated by the athletic ideal, which was expressed in broad rounded, solid shoulders and powerful incurved back. The high classical period begins towards the middles of the 5th century BCE. The 4th century BCE is the late classical period. The face has become rounder and flesh was more delicately modeled and the lips slightly paired. The period between 330 and 30 is called Hellenistic. Naturalism is an important feature of Hellenistic period as compared to the idealism of classical period. It was the time when Greek artist came in to contact with the other world and the pure Greek art was influenced by foreign elements.

According to Juhyung Rhi, Gandhāra is famous for the creation of the first Buddha images along with Mathurā in northern India. Although the precedence between the two places was the issue of heated debate in the early 20th century, scholars tend to support the simultaneous and independent origin of the Buddha image in both places or to favor the precedence of Mathurā over Gandhāra. The origin of the Buddha image has been frequently attributed to the Mahayanists (Rhi 2003:153).

The art represented by the Gandhāra sculptures is the result of the union of the older Indian art and Hellenistic art as it was known in Bactria. It was thus not a new departure, but merely a new development. Many of the old motifs were retained practically unchanged; others were modified, others almost transformed. Many new ideas were introduced by the Graeco-Bactrian artists, of all the new additions to Indian art, which resulted from this union of the Hellenistic genius with Buddhist piety, by far the most important was the figure of Buddha himself. There is no doubt that Buddha image was originated in the Peshawār valley and that the Buddha figures of Gandhara are not only the oldest in the world, but also the direct source from which the artists of Central Asia and the Farther East, drew their inspirations (Banerjee 1920: 76). About the development of Buddha image, D.B. Spooner observes in the following words:

> "Whatever we may think of the later development of the Buddha figure in India proper, there is no doubt but that it originated here in the Peshawār valley, and that the Buddha figures of Gandhāra are not only the oldest in the world but also the direct source from which the artists of central Asia and the further East drew their inspiration. All of which of course invests them with very treat historical interest and importance (Spooner : 1910: 37)".

In the views of Sir John Marshall, the beginning of Gandhāra art is witnessed in the Saka period. He put his views that Gandhāra art came into being in the last century before the Christian era, when the Sakas were ruling in the North-West and while the prevalent Hellenistic art which they had inherited form their Greek predecessors had already reached a decadent state. The character of this art and the way in which it declined under the Sakas, and was subsequently given a new lease of life after the Parthian conquest, is clearly apparent, in a series of ornamental toilet-trays of Gandhāran workmanship which were discovered from Taxila. Most of these objects are clearly Hellenistic, and there can be no question that this

type of toilet-tray was introduced with Hellenistic culture from the West, where numerous specimens have been found especially in Egypt (Marshall 1960: 17).

Sir John Marshall further describes that after the revival of Hellenism under the Parthians, the sculptors of Gandhāra followed a like course. At that time a favorite theme, of Graeco-Parthian secular art was the drinking-scenes, and incongruous as it may seem, this was one of the earliest themes to be adopted for the decoration of Buddhist Stūpas. During the Kushan rule, the Gandhāra art was in a formative, adolescent stage when we can discern more clearly than at other times the efforts of the artists to overcome their initial difficulties, to reconcile Greek and local ideas, and to create from them a new synthesis of religious art suited to the needs of the Buddhist (Marshall 1960: 40). The views of Jas. Burgess about the image of Buddha are:

> "The representation of the founder of the Buddhism religion appears as a finished type. He is given again in the form of a young man, in a long robe which covers both shoulders. The face, in the older and more ideal conceptions, shows features resembling those of Apollo, while on the more modern and more stereotyped pieces the features are distinctly Hindu (Burgess 1985: 86)."

Alfred Foucher provides his opinion about the image of Buddha in the following words:

> "The image of Buddha is like a trade-mark of the workshops of Gandhāra. It remains to learn how it was itself manufactured. We are agreed that at the time of its composition the Indian material was poured into a western mould: among all the possible results of this operation, which one definitely emerged from the foundry? This, we have till to analyzeat the risk of passing from one surprise to another" (Foucher 1914: 130).

However, according to Ananda K. Coomaraswamy, Buddha image is adopted from that of the "Yaksha", once a designation of the supreme deity and later of various tutelary divinities. This early type is monumental in the extreme, the figures being often above life size and no less impressive in their suggestion of the operation of a catalytic power than they are in actual scale. Further that the Hellenistic influence had resulted in the development of Buddha type, equally Indian in iconography, but Western in feelings (Coomaraswamy 1935: 19).

It is true that the artists of Mathurā and Gandhāra were supposed to represent the figure of Buddha with the thirty–two greater and eighty lesser physical marks (lakshana), which were listed in texts probably written at about the same period as the first anthropomorphic images of the Buddha were made. Among these marks the most important recognizable were however; the protuberance on the skull called as "Ushnisha" (top knot) which considered to indicate wisdom, a tuft of hair called as "urna" between the eyebrows, a wheel with spokes on the soles of his feet, and a web between the fingers and toes. A.K Coomaraswamy describes that the early images of Buddha are classical Greeks but obviously Greco-Roman style is thoroughly incorporated with Indian and Persian motifs, including depiction of hair, turban, lotus thrones and other motifs. The Buddha image of mind seems to have appeared during Buddha's lifetime, but its visual aesthetics and transformation into a medium which come to mind around the 1st Century CE i.e. after the death of about five to six hundred years. The image of Buddha is par excellent in is modeling and anatomical proportions. The art of Mathurā inherited the features of Buddha image depicted in Gandhāra. A.K Coomaraswamy further mentions that it has been argued from the Gandhara Buddhas of the Apollo type that the Buddha image is of Gandhara origin and first came into being at Gandhāra. There do not exist, either in Gandhāra or in India proper, Buddha image known to be earlier than the first century CE. In both areas they appear simultaneously, in Hellenistic types at Gandhāra and in the tradition of ancient Indian art at Mathurā. It is agreed that the earliest Gandhara figure are "already stereotyped" and that Buddha figures must have been made as early as the first century BCE (Coomaraswamy 1913: 37).

However, Scott Blair, mentions that it was in Gandhāra that the first images of the Buddha were created. However, the causes of these changes have remained unclear. The evidence suggests that the presence of Hellenistic Greeks, referred to as Indo-Greeks, played an important role in this development. From the time of

Alexander the Great's invasion in the 4thc century BCE to the rise of the Sassanid's in the 3rd century BCE, Greek culture was present in the region and contributed to the development of Gandharan Buddhism (Blair 2009: 1).

According to Madeleine Hallade, one thing seems to be a certain sign of late date: a hair style, rather rare, formed of rows of short snail shaped curls. They seem to have followed experiential styles at both Gandhāra and Mathurā. His emotionless face and half-closed eyes express his total detachment from the material world, while the face expressions suggest his compassion towards all creatures. However, the face repeated by craftsmen of varying skill, gradually became conventional and degenerated. Furthermore, losing their naturalness, the waves of the hair are too often finished by becoming as dry. The eye lids of Buddha images show Indian features and influence (Hallade, 1968: 83-84).

The costume of Buddha is the same as that worn by the Buddhist community. In Gandhāra all three pieces appear but the two undergarments are very rarely seen except in standing figures where the bent right arm lifts the hem of the thick monastic cloak. At Mathurā, on the other hand, the sanghati is rarely used; the right shoulder remains bare and the thinness of the material of the two undergarments allows the body to be seen. Though the monastic habit of the Buddha is Indian but its treatment is inspired by Hellenistic and Roman draperies. The upper part of the material being rolled round the neck, the folds fall naturally from the left shoulder to form pleasant curves in front of the body. In this position the right arm is generally bent back so that the raised hand, with palm turned to the front, makes a gesture of reassurance to the faithful, abhayamudrā. The left arm is almost straight and the hand holds a fold of the cloak which falls from it in vertical pleats. There is adoption of a position familiar in Greek Art in standing position of Buddha in which leg is supporting the weight of the body on one leg with the other leg slightly bent, a more flexible appearance (Hallade 1968: 84).

A detail description about the Buddha image is provided by W. Zwalf who describes that the Gandhāran images showed the Buddha standing or seated his robes in the Graeco-Roman tradition of drapery in more or less realistic folds; hair was usually in wavy lines and the cranial bump or 'Ushnisha'. He further describes that since early Mathurā Buddhas have been found in Gandhāra while Gandhāran influence on Mathurā appears late, it was concluded that the first Buddha images were in the Indian Mathurā type, while the Gandhāran Buddha grew out of that prototypes by incorporating the local Graeco-Roman stylistic features. This development is dated to the last century BCE and the first Century ACE. During the first century CE, under Kushan Rule, a coin of Kanishka- I, bears the standing figure captioned "Buddha" shows a developed type which looks Gandhāran. The Gandhāran style produced between the first and sixth centuries CE a large number of images and narrative reliefs in stone and later in stucco, using moulds to multiply images in the interest of increasing merit (Zwalf, 1985: 92). Benjamin Rowland Jr. has described in detail the influences of Hellenistic traditions in Gandhāra art in the following words:

> "It seems not too bold to suggest that, just as the hieratic Buddha and Bodhisattva types of early Gandhāra, one established, persisted with little change in iconography or style into the very last phase of the school, so the more properly speaking secular types, originally derived from true late Hellenistic and Augustan forms, enjoyed quasi-immortality through repetition from generation to generation, and, perhaps, as Barthoux suggests, renewed by itinerant artists from the Roman east of later periods introducing new waves of classical influence(Rowland 1949: 9)".

Rowland further says that while preserving the dryly spiritualized formula of early Gandhāra art for the Buddha image, the sculptors of Taxila and Hadda in the 5th century, in lay figures and grotesques, present a living array of types that is without doubt the end of a style that had its beginnings in the stucco heads of the 5th century CE. The vitality of the late sculpture of northwestern India is strongly suggestive of the dynamic character of Roman provincial art, the so-called "Gothic" character of the Hadda sculpture is far from difficult to reconcile with Roman provincial art, since this same quality is present in monuments made by the "barbarians"

on all the fringes of the Roman world empire (Rowland 1949: 10).

Anna Filigenzi has however, is very particular when she says that the history of studies on the art of Gandhāra could be summarized as; analysis of the formal and iconographical elements in relation to the various components including Hellenistic, Roman, Indian and Persian (Iranian), origin of the anthropomorphic Buddha image, identification of the subjects and in the absence of safe reference for an absolute chronology, a broad criterion to order the bulk of Gandhāran production at least within a relative chronological framework. Despite the great quantity of objects known we have scanty historical and archaeological data on them. It is further described by this writer that:

> "This was how the art of Gandhāra appeared to the first great commentators namely; Vincent Smith, Emile Senart, Alfred Foucher, Albert Grunwedel, to whom we owe the deciphering of a large part of the iconographic representations, models of derivation and the myriad morphological and stylistic units which constitute its structure (Filigenzi 2002: 350)".

The details of their context, relations in terms of the physical and chronological sequence as well as provenance are also not completely implicated.

According to Masatoshi A. Konishi, Gandharā may be still remembered as a cradle of the Buddha image also. He says that we have to be very careful to this problem either, although we have a monumental work done by Dr. O. Takada in Japan. There had been once a tendency to considerer that Greek rationalism broke a bigotry aniconism of the Indian Buddhism, but even in Mathura in Central India had long and rich history of iconism since the prehistoric time. They could not represent the Buddha as an image, but carved freely the Bodhisattva image. However, sooner or later, they could have carved the image of Buddha; one had only to wait the time to ripen then, both in Mathurā and Gandhāra, to further carve the image of Buddha himself as an icon, based on the popular demands and possibly and partly due to the change of doctrines.

On the basis of recent archaeological excavation results at Butkara-I, by the Italian Archaeological Mission, it has been observed that the earliest images of Butkara-I show not the "Buddha/Apollo" held by many to be most typical of the genuine Gandhāran product, but a far more "Indian" Buddha with characteristics very close to the production of Mathurā. Moreover, the figurative conception behind the earlier set of sculptures as "draftsmanly" (Filigenzi 2003: 352).

We have finally arrived on such a point to conclude and not only quote but agree with the views of Masatoshi A. Konishi in our support who has rightly mentioned that in Gandhāra, there were Indo-Parthians behind the new movement in first century BCE to first century CE. Through them, Gandhāra might have accepted much Central Asian, Scythians, Iranians and the Roman or the Hellenistic influences. It was however, Gandhāra under the Kushanas that the splendid fusion of these elements really took place, and one has to clarify more to substitute the socio-political, economical, cultural and religious conditions behind this newer movement (Konishi 1998: 68). The most ancient numismatic evidences at Taxila valley, to which the Greek influence may be ascribed, dated also from the reign of king Azes who ruled in the last decade of the first century BCE. The influence of Greek art was very marked from the first and second centuries BCE to about the 2nd and 3rd centuries CE, and the most flourishing period preceded the reigns of the great Kushanas rulers, Kanishka and his successors. However, whatever influence, Hellenism had exhausted on Indian art, was practically exhausted by 400 CE. After this period traces of Hellenistic ideas are very less to be revealed.

References

Banerjee, Gauranga Nath. (1920). Hellenism in Ancient India, Butterworth and Co. Calcutta, India.

Blair, Scott .(2009). Answers for Milinda: Hellenistic influence on the Development of Gandhāran Buddhism, TCNJ, Journal of Student Scholarship, Vol. XI, College of New Jersey, USA.

Burgess, Jas. (1901 & 1985). Buddhist Art in India, translated from the "Hand book" of Prof. Albert Grunwedel, by Agnes C. Gibson, Revised & Enlarged by James Burgess, Cosmo Publication, New Delhi.

Coomaraswamy, A.K. (1913). Reprint 1966 & 1969, Introduction to Indian Art, MunshiramMonoharlal, Oriental Publication, Delhi, India.

Coomaraswamy, A.K. (1935). An Approach to Indian Art, College Art Association, Vol.7, No.7.

Filigenzi, Anna. (2002). Narrative Art in Gandhara. In At the Origin of Gandhara Art, The Contribution of the IsIAO Italian Archaeological Mission in the Swāt Valley, Pakistan, Ancient Civilizations from Scythian to Siberia, 9(3-4): 350-375, Brill, Leiden, Boston.

Foucher, A. (1914). The Beginnings of Buddhist Art, London.

Hallade, Hadeleine. (1968).TheGandhara Style and the Evolution of Buddhist Art, Thames and Hudson, London.

Huntington, John C. (1985). The Origin of the Buddha Image: Early Image Traditions and the Concept of BuddhadarSanapunyā, Studies in Buddhist Art of South Asia, Edited by A.K. Narain, Kanak Publications, New Delhi, India.

James, Burgess. (1985). Buddhist Art in India, translated from the "Hand book" of Prof. Albert Grunwedel, by Agnes C. Gibson, revised & enlarged by James burgess, Cosmo Publication,(First Pub. 1901), New Delhi, India.

Marshall, Sir John. (1960). The Buddhist Art of Gandhara*, Cambridge University Press*, England.

Oldenburg, Sergej Fedorovic & Wiener Leo. (1897). Notes on Buddhist Art, Journal of the American Oriental society, Vol. 18, USA.

Rhi, Juhyung. (2003). Early Mahayana and Gandharan Buddhism: An Assessment of the Visual Evidence, The Eastern Buddhist Society, New Series, Vol. XXXV, Nos. 1& 2.

Rowland Benjamin. (1949). The Hellenistic tradition on Northwestern India, The Art Bulletin, Vol. 31, No.1.

Sinha, Nirmal C. (1987). A Preface to Mahayana Iconography, Bulletin of Tibetology, Vol. 23, No.3, Namgyal Institute of Tibetology, India.

Sivaramamurti, C. (1954). A Guide to the Archaeological Galleries of the Indian Museum, Issued by the Trustees of the Indian Museum, Calcutta, India.

Spooner, D. Brainerd. (1910). Handbook to the Sculptures in the Peshawar Museum, Thacker & Company, Limited, Bombay, India.

Tanweer, Tahira & Khan, Muhammad Bahadur. (1999). Research Journal, Vol. II, Department of Fine Arts, University of Peshawar, Peshawar, Pakistan.

The Cross Roads of Asia: Transformation in image & symbol (1992) Exhibition at Fitzwilliam Museum, Cambridge, The ancient India and Iran Trust, Singapore.

Zwalf, Wladimir. (1985). Buddhism, Art and Faith, British Museum Publication, London.

تبصره کتب

وال پينٽنگز آف سنڌ

صراط گوهر دائودپوٽو

سنڌ جي عمارتن جي ڀتين تي ڪمانگريءَ جي فن تي
ڊاڪٽر ذوالفقار علي ڪلهوڙي جو ڪتاب ”وال
پينٽنگز آف سنڌ“

هن مضمون ۾ ڊاڪٽر ذوالفقار علي ڪلهوڙي جي سنڌ جي مقبرن، مسجدن ۽ محلن جي ڀتين تي ٺهيل تصويرن (هتي کان پوءِ پينٽنگ) تي تازي ڇپيل ڪتاب ”وال پينٽنگز آف سنڌ“ جو مختصر جائزو پيش ڪيو ويو آهي. ليک کي ٽن حصن ۾ ورهايو ويو آهي: پهرين حصي ۾ بحث هيٺ ڪتاب جي ليکڪ جو تعارف ڏنل آهي؛ ٻئين حصي ۾ سنڌ ۾ پينٽنگ جي تاريخ بابت مختصر معلومات پيش ڪئي وئي آهي؛ ۽ ٽيون حصو ”وال پينٽنگز آف سنڌ“ بابت آهي.

ذوالفقار علي ڪلهوڙو: هڪ پاڪستاني اينٿروپالاجسٽ

اسلام آباد ۾ رهائش پزير، ڊاڪٽر ذوالفقار علي ڪلهوڙي جي پيدائش 4 جنوري 1977ع ۾ ضلعي قمبر-شهدادڪوٽ جي تعلقي وارهه جي هڪ پراڻي ڳوٺ نالي آباد ڪلهوڙا جي باااثر شخصيت مير محمد ڪلهوڙو جي گهر ۾ ٿي. پروفيسر ذوالفقار پرائمري تعليم پنهنجي اباڻي ڳوٺ مان حاصل ڪرڻ کان پوءِ گورنمينٽ پائلٽ اسڪول لاڙڪاڻي ۾ داخلا ورتي ۽ ٻارنهن درجا پاس ڪيائين. ان کان پوءِ، اعلي تعليم لاءِ پاڪستان جي گاديءَ جي شهر اسلام آباد آيو ۽ ملڪ جي بهترين اداري قائداعظم يونيورسٽي ۾ اينٿروپالاجي شعبي جي چونڊ ڪيائين. اينٿروپالاجي شعبي مان ماسٽر جي ڊگري حاصل ڪرڻ کان پوءِ ساڳي ئي شعبي ۾ ايم فل به ڪيائين. ايم فل کان پوءِ، تحقيق سان گڏوگڏ، قائداعظم يونيورسٽي ۽ پاڪستان انسٽيٽيوٽ آف ڊولپمينٽ اڪنامڪس ۾ پڙهائڻ لڳو. انهي عرصي ۾ پاڪستان جي مشهور آرڪيالاجسٽ پروفيسر احمد حسن داني جي اداري ٽيڪسلا انسٽيٽيوٽ آف ايشين سولائيزيشنز، قائداعظم يونيورسٽي ۾ داخلا وٺي پنهنجي پي ايچ ڊي به مڪمل ڪيائين. سندن پي ايچ ڊي ۽ ايم فل جي تحقيق جو موضوع سنڌ جي تاريخ، فنِ تعمير ۽ آرٽ ۽ ماڻهن جي عام زندگي هو. هونئن ته ذري گهٽ پاڪستان جي هر علائقي تي ڪم ڪيو اٿن پر سندن تحقيق جو گهڻو حصو سنڌ ۽ پُنواڙ جي ثقافتي ورثي، لوڪ آرٽ، ادب ۽ تاريخ ۽ مذهبي زندگي تي آهي. ڊاڪٽر ذوالفقار جون هيل تائين 250 کان وڌيڪ لکڻيون ڇپجي چڪيون آهن. جن ۾، 10 ڪتاب آهن، 46 تحقيقي مقالا آهن ۽ 200 کان وڌيڪ اخباري ليک، جيڪي پاڪستان جي مختلف انگريزي اخبارن ۾ ڇپيا، ۽ ڪوڙ سارا بيا ليک آهن. سنڌ کان تعلق رکندڙ هن عظيم اينٿروپالاجسٽ (۽ آرٽ هسٽوريئن) کي پاڪستان جي اينٿروپالاجي، آرڪيالاجي، قومي ورثي ۽ تاريخ تي ڪم ڪندڙ چند اهم شخصيتن ۾ شمار ڪيو وڃي ٿو.

ڊاڪٽر ذوالفقار پاڪستان جي معاشيات ۽ ترقياتي اڀياس جي بهترين اداري پاڪستان انسٽيٽيوٽ آف ڊولپمينٽ اڪنامڪس جي ڊولپمينٽ اسٽڊيز شعبي ۾ بطور سربراه پنهنجون خدمتون پيش ڪري رهيا

آهن. ان سان گڏوگڏ، پاڻ، پنهنجي اداري جي شاگردن کان سواءِ، قائداعظم يونيورسٽي جي اينٿروپالاجي ۽ آرڪيالاجي شعبي ۾ ايم فل ۽ ماسٽرز جي شاگردن کي پڙهائيندا به آهن. ائين نظر ايندو آهي ته سندن چست رهڻ جو راز علم سان چاهه ۽ پاڪستاني ثقافتن کيڄاڻڻ جي جستجو آهي.

سنڌ جي سڀ کان پراڻي پينٽنگ؟

سنڌ ۾ موجود پينٽنگز تي تمام گهٽ ڪم ٿيو آهي، خاص ڪري ان جي تاريخ تي. اهو ڄاڻڻ لاءِ ته سنڌ ۾ پينٽنگ جي شروعات ڪڏهن ٿي وڌيڪ تحقيق جي ضرورت آهي. هيل تائين ان حوالي سان جيترو ڪم ٿيو آهي ان مان ظاهر ٿئي ٿو ته سنڌ ۾ قديم ترين تصويرون سنڌ-ڪوهستان جي پهاڙن ۾ ملن ٿيون جن جو ذڪر ذوالفقار علي ڪلهوڙي جي ڪتاب ”سئمبلز ان اسٽون: دي راڪ آرٽ آف سنڌ“ ۾ ملي ٿو. اهي تصويرون ڪراچي ضلعي ۾ لاهوت جي ٽڪريءَ واري مقام تي قدرتي رنگن سان پٿرن تي ٺاهيون ويون آهن (وڌيڪ معلومات لاءِ ڏسو ڪتاب ”سئمبلز ان اسٽون: دي راڪ آرٽ آف سنڌ“). ڊاڪٽر ذوالفقار جي اها کوج الاهي اهم آهي ڇو ته ان سنڌ ۾ چٽڪاريءَ بابت ڄاڻ ۾ اضافو ڪيو آهي. وڌيڪ ته، بحث هيٺ ڪتاب جي تعارف ۾ ليڪڪ سنڌ ۾ پينٽنگز جي تاريخ کي بيان ڪندي لکيو آهي ته محمد ادريس صديقي ۽ شيخ خورشيد حسن سنڌ ۾ پينٽنگز جي شروعات ۽ واڌ تي روشني وڌي آهي. خورشيد حسن مطابق سنڌ ۾ منيئيچر (ننڍي) پينٽنگز جو سڀ کان پراڻو حوالو محمد بن قاسم جي سنڌ فتح ڪرڻ واري وقت جو آهي، جڏهن سنڌي ماڻهن محمد بن قاسم جي خوش آمد ۾ سندس تصوير ٺاهڻ جي اجازت گُهري هئي. پر، اڄ تائين، اهڙي ڪا به تصوير نه ملي آهي. پٿر تي ٺهيل پراچين دور جي رنگين نقشن کي ڇڏي ڪري، سنڌ مان، هيل تائين، جيڪا سڀ کان پراڻي پينٽنگ ملي آهي اها سمن جي دور جي آهي. چيو وڃي ٿو ته سمن جي دور، خاص ڪري ڄام نظام الدين جي دورِحڪومت، ۾ الاهي پينٽنگز ٺاهيون ويون جن مان صرف هڪ ئي اڄ تائين محفوظ حالت ۾ ملي ٿي. اها پينٽنگ هِرات جي بادشاهه سلطان حسين بايقرا، جيڪو ڄام نظام الدين جو همعصر هو، جي آهي.

”وال پينٽنگز آف سنڌ“ جو اڀياس

ڊاڪٽر ذوالفقار پنهنجي ڪتاب ”وال پينٽنگز آف سنڌ: فرام ايٽينٿ ٽو ٽئنٽيئٿ سينچري“ ۾ سنڌ ۾ موجود ڪلهوڙن، ٽالپرن ۽ انگريزن جي دور جي مقبرن، مسجدن ۽ محلن جي ڀتين تي ٺهيل پينٽنگز تي غور ڪيو آهي. ڪتاب ڇپيندڙ جي نوٽ، مقدمي (يا پهِ اکر)، تعارف، حوالن ۽ فهرست سان گڏ، هي ڪتاب نو (9) بابن تي مشتمل آهي. بابن جا عنوان هي آهن: (ترجمو) (1) ڀتين تي تاريخ؛ (2) ڏيکاءُ داستانِ سورٺ راءِ ڏياچ ۽ ٻيجل؛ (3) سسُئي ۽ پنهون جي قصي جي نقاشي؛ (4) سوهڻي ۽ ميهار جو پيار؛ (5) ليلا-مجنون، نوري ڄام تماچي، مومل-راڻو ۽ عمر ماروي جا عشقيه داستان؛ (6) سانگهڙ، دادو ۽ قمبر-شهدادڪوٽ جا رنگ آميز قُبا؛ (7) مقدس جاگرافيون: ڀتين تي ٺهيل مسجد، مڪي ۽ مديني جون تصويرون؛ (8) رنگ آميز مسجدون ۽ محل؛ ۽ (9) دستگير ۽ ڪمانگر.

انهن موضوعن تي مواد اڻلڀ آهي، ڊاڪٽر ذوالفقار جو هي ڪتاب ان حوالي سان خاصي اهميت

رکي ٿو ڇو ته ان ۾ انهن موضوعن بابت اهم معلومات ڏنل آهي. هن مختصر ليک ۾ ڪتاب جي هر هڪ باب تي الڳ سان تفصيلي بحث نه ٿي ڪري سگهجي پر، گهٽ ۾ گهٽ، مختصر وضاحت پيش ڪري سگهجي ٿي. ڊاڪٽر ذوالفقار پهرين باب ۾ سنڌ جي قبن ۾ چٽيل جانورن جي شڪلين، شڪار ۽ جنگ جي منظرن ۽ راڳ ۽ جُهمر جي ميلن تي روشني وڌي آهي. ٻئين کان پنجين باب تائين، چئن بابن ۾، سورٺ راءِ ڏياچ ۽ ٻيجل، سسُئي ۽ پنهون، سوهڻي ۽ ميهار، ليلا-مجنون، نوري جام تماچي، مومل-راڻو ۽ عمر ماروي جي عشقيه داستانن جي پينٽنگز جو ذڪر آهي. ليکڪ انهن پينٽنگز کي لوڪ ادب جي روشنيءَ ۾ ڏسندي هر هڪ داستان کي ورائي لکيو آهي. انهن عشقيه داستانن جا منظر ۽ ٻيا نقش ڪلهوڙا دور جي دادو، قمبر-شهدادڪوٽ، نواب شاه ۽ سانگهڙ ضلعن ۾ واقع لڳ ڀڳ سيني مقبرن ۾ ملن ٿا، جڏهن ته ٽالپرن ۽ بعد جي کوڙ سارن عمارتن ۾ به اهي نشان پڌارا آهن. پر، سورٺ راءِ ڏياچ ۽ ٻيجل جو داستان صرف شهدادڪوٽ ۾ جمالين، صوبدار خان ۽ ريحان خان، جي مقبرن ۾ ملي ٿي. ڊاڪٽر ذوالفقار لکيو آهي ته ڪلهوڙا دور جون اوائلي پينٽنگز ميان نصير محمد ڪلهوڙي (نصير فقير) جي قبرستان، ڳاڙهي ضلعي دادو، ۾ ملن ٿيون. وڌيڪ ته سنڌ ۾ پينٽنگ جو فن سمن جي دور ۾ وڌيو ۽ ڪلهوڙن جي دور پنهنجي عروج تي پهتو (ان جو بهترين ثبوت نصير فقير جي قبرستان ۾ ملي ٿو). جڏهن ته ڇهين باب ۾ سانگهڙ، دادو ۽ قمبر-شهدادڪوٽ جي انهن مقبرن جي وضاحت ڏنل آهي جن ۾ پينٽنگز ملن ٿيون. ان باب ۾ سانگهڙ ۾ واقع نظاماڻين جا قُبا؛ جوهي ۾ لغارين، جمالين ۽ لُنڊن جا مقبرا؛ قمبر-شهدادڪوٽ ۾ چانڊين جا مقبرا ۽ ٻرگهه بالا ۾ مير اللهيار جي مقبري جي باري ۾ تفصيلي معلومات ڏني وئي آهي. جڏهن ته ستون باب صرف انهن قُبن ۽ هڪ مسجد تي لکيل آهي جنهن جي ڀتين تي مسجد، مڪي ۽ مديني جون تصويرون لڌيون ويون آهن. اهڙا مقبرا جن ۾ مسجد ٺهيل آهي شاهن فقير رودناني جي قبرستان، بليل شاهه، مير اللهيار جي قبرستان، روات فقير قبرستان ۾ آهن ۽، جڏهن ته، مڪي ۽ مديني جون پينٽنگز ٽنڊو محمد خان ۾ واقع سيد حسن علي (مها ولي) جي مقبري، سنگهارو شريف ۾ پير نور محمد قادري ۽ بچل شاهه جي مقبرن جي ڀتين تي ٺهيل آهن. ۽، دادو شهر جي گلزارِمدينه مسجد ۾ مڪي جي پينٽنگ ملي ٿي. ان باب ۾ ڊاڪٽر ذوالفقار لکيو آهي ته سنڌ ۾ قعبي جي سڀ کان پراڻي تصوير قُبو شهداد قبرستان ۾ جام ننڊو جي مسجد، جيڪا ڪلهوڙن جي دور ۾ تعمير ڪرائي وئي هئي، ۾ ملي ٿي.

رنگ آميز مسجدن ۽ محلن تي لکيل اٺين باب ۾ ليکڪ هنن عمارتن کي شامل ڪيو آهي: جامع مسجد خداباد، مٽياري جي جامع مسجد ۽ منارن واري مسجد، بُڪيرا شريف جي شاه چراغ مسجد، ضلعي ٽنڊي اللهيار جي ڳوٺ شاديون والهاري جي مسجد ۽ حيدرآباد، ٽنڊو محمد خان ضلعن جون ڪجهه مسجدون، ۽ خيرپور ۽ ڪوٽ ڏيجي ۾ ٽالپرن جوفيض محل، بالڍءَ جو بنگلو (دلشاد منزل) ، ڪوٽ بنگلو شاهي محل ۽ اڇو محل (اڇي اوطاق). جڏهن ته ان باب جي محلن واري حصي ۾ تصويرون صرف ڪوٽ بنگلو شاهي محل جون ڏنيون ويون

آهن. آخر ۾، آخري باب ۾ سنڌ ۾ ڪمانگريءَ جي تاريخ تي روشني وڌي وئي آهي، مثال جي طور تي ڪمانگري جو فن ۽ طريقو، سنڌ جا ڪمانگر ۽ ڪمانگريءَ جا ورڪشاپ، رنگ ٺاهڻ جو طريقو ۽ رونگ وغيره.

ڊاڪٽر ذوالفقار پنهنجي ان ڪتاب ۾ پڌرو ڪيو آهي ته سنڌ جي ڪمانگرن تي غير سنڌي فن، ادب ۽ علم، معمارن ۽ ڪمانگرن جو گهرو اثر رهيو آهي. ۽، وڌيڪ، سنڌ ۾ جيڪي به ڪمانگريءَ جا نمونا ملن ٿا صرف سنڌي ڪاريگرن جو ڪم نه آهي، ملتاني، بهاولپوري ۽ جوڌپوري ڪاريگرن جو به ان ڪم ۾ نمايان ڪردار رهيو آهي.

”وال پينٽنگز آف سنڌ“ انگريزي ٻوليءَ ۾ لکيل آهي. ليکڪ پنهنجي پوري مهارت سان سادي ۽ آسان ٻولي استعمال ڪئي آهي ته جيئن عام ماڻهو به ڪتاب مان فائدو ڪڍي سگهي. ان سان گڏوگڏ ڪتاب جي ٻي خاصيت اعلي معيار جون تصويرون آهن جيڪي ڪتاب جي سونهن ٻڌيل آهن. سن ٢٠٢٠ع ۾سلڪ روڊ سينٽر اسلام آباد پاران پڪي جلد ۾ ڇپيل 222 صفحن تي مشتمل هن ڪتاب جي قيمت -/4000 روپيا آهي.

ڪنسلٽنٽ (ڪلچرل هسٽوريئن) نيشنل انسٽيٽيوٽ آف فوڪ اينڊ ٽريڊيشنل هيريٽيج (لوڪ ورثه) اسلام آباد، 16 جولاءِ2021

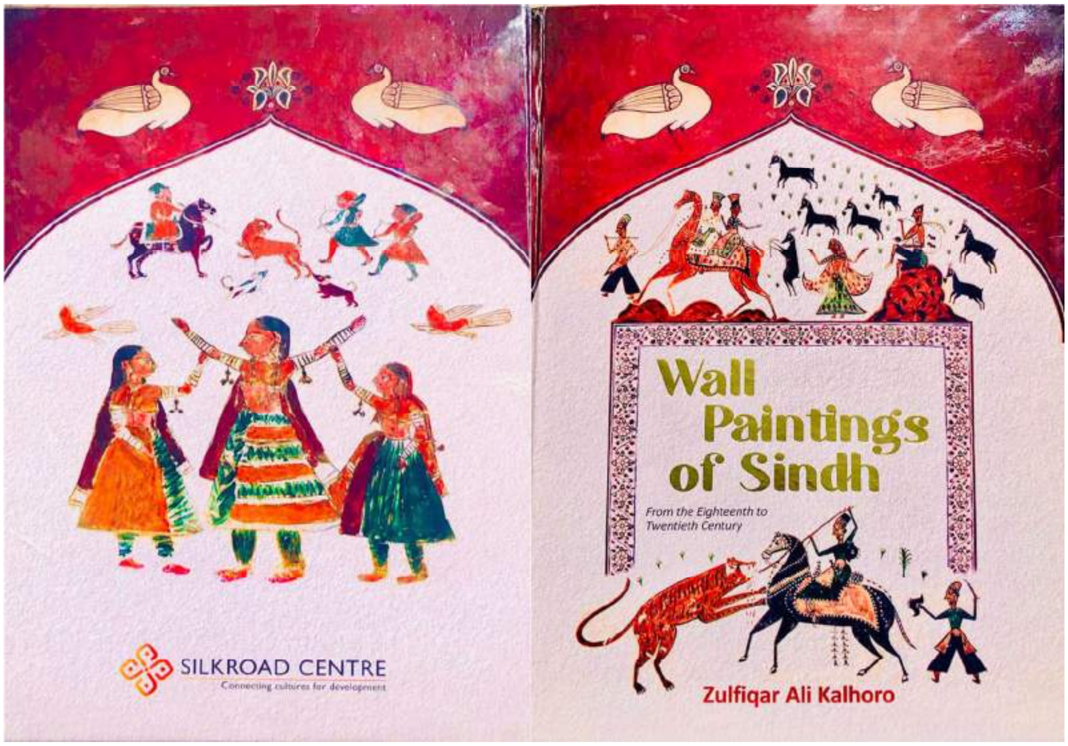

منصورہ کے ھباری حکمران سکوں کی روشنی میں

سندھی مقالہ -عبداللہ خان وریامرحوم، اردو ترجمہ -شیخ عاطف علی

منصوره جا هباري حاڪم سڪن جي روشني ۾ سنڌ جي تاريخ ڪيترن بابن تي اڃا تائين اونداها پرده پيل آهن .جن بابت اسان ڪي يا ته ڪابه ڄاڻ نه آهي .يا تمام گهٽ ۽ نا مڪمل معلومات ملي سگهي آهي . جنهن سان ان دور جي مڪمل ۽ پڪ واري تاريخ ترتيب نٿي ڏئي سگهجي.ضرورت ان ڳالهه جي آهي .ان ڏس ۾ تحقيق ٿيي ۽ سنڌ جي تاريخي ۽قديم دڙن جي مڪمل کوٽائي ڪرائي اتان مليل شاهدين ۽ معلومات جي آذار تي سنڌ جي تاريخ لکجي ۽ بجا پراڻن حوالن کي ورجائڻ ۽ من گهڙت ڏکن هٽڻ جي جديد سائنسي اصولن کي استعمال ڪجي ته جيئن اسين به دنيا جي ٻين قومن آ ڏو پنهنجي تاريخ فخر ۽ پڪ سان پيش ڪري سگهون. منهنجي مقالي ۾ سنڌ جي هباري حڪمرانن بابت لڌل سڪن ۽ ڪتبن جي آذار تي سندن حڪومت جو دور مقرر ڪيو ويو آهي۽ ڪجهه نؤن حاڪمن جا نالا ظاهر ڪيا ويا آهن .جن بابت هن کان اڳ ڪابه معلومات نه ملي آهي. هن مقالي ۾ منهنجي ڪوشش اها آهي .ته پنهنجي تحقيق ۾ پڪين شاهدين جي آذار تي حقيقتون پيش ڪجن ۽ ساڳيون ڳالهيون وري ورجائڻ کان پاسو ڪجي. سنڌ کي عرب فوج جي فتح ڪرڻ (۹۳هـ-۷۱۲ع) بعد اسلامي خلافت ۾ شامل ڪيو ويو هو. جتان وقت بوقت حڪومت هلائڻ لاءِ اموي خليفن ۽ پوءِ عباسي خليفن پاران حاڪم ۽ انهن جي مدد لاء ساز و سامان ۽ فوجون اينديون رهندو هيون .ته جيئن ملڪي نظام درست ٿي ۽ اندروني بغاوتن کي منهن ڏئي سگهجي .عربن سنڌ ۾ ڪن قديم شهرن آباد ڪيو ۽ ڪي نوان شهر پڻ ٻڌرايا ۽ اتي عرب قبيلن ڪي آباد ڪيو.اهڙن شهرن ۾ اروڙ . ديبل . نيرون . ملتان .بيضار.بانيه. محفوظ ۽ منصوره قابل ذڪر آهن. سنڌ ۾ آباد ٿيندڙ عرب قبيلن حجاز جي قريشي قبيلي هباري سنڌ ۾ رهي جيڪو مرتبو حاصل ڪيو ۽ پنهنجي همت ۽ طاقت سان خودمختيار حڪومت قائم ڪئي .ان جو مثال ملن مشڪل آهي.

اموي خليفي هشام بن عبدالملڪ (۱۰۵-۱۲۵ھ مطابق ۷۲۴-۷۴۴ع) جي پاران سنہ ۱۱۲ھ ۷۳۱ع ۾ الحڪم بن عوانہ الڪلبي سنڌ جو حاڪم ڪري موڪليو ويو. ان سان وڏي لشڪر ۽ محمد بن قاسم جي پٽ عمرو کان سواءِ هڪ ٻيو شخص مندر بن زبير بہ گڏ آيو هو.جيڪو عراق جي شهر بصره جو رهندڙ هو.سند ۾ اهو شخص منصوره جي اتر طرف هڪ ڏينهن جي سفر تي بانيہ نالي هڪ ننڍڙي شهر ۾ اچي رهيو . پهرين عباسي خليفي ابوالعباس سفاح (۱۳۲-۱۳۶هجري مطابق ۷۵۰-۷۵۶ع) جي وقت پاڻ قرقيسيہ هليو ويو ۽ اتي باغين جي اڳواٽي جي جرم ۾ ۱۳۳,هجري ۷۵۶ع ۾ قاسي چڙهي ويو .سندس خاندان جا فرد ۽ سندس پٽ عبدالغريز بن مندر بانيہ تي رهيا . سندس خانداني شجرو هن ريت آهي. عبدالعزيز بن مندر بن زبير بن عبدالرحمان بن هبار بن اسود هي خاندان سندن ڏاڏي هبار جي نالي پويان هباري سڏيو هو . اموي توڙي عباسي خلافت جي دور ۾ ۽ هن خاندان جا فرد حڪومت جي ڪمن ڪارين ۾ شريڪ رهيا . اڳتي هلي سنڌ ۾ رهندڙ حجازي عمر جي اڳواٽي ۾ گڏ ٿي ويا .عمر بن عبدالعزيز هباري جو سنڌ تي تمام گهڻو اثر هو . عباسي خليفي جو مقرر ڪيل ڪو به سنڌ جو حاڪم هن سان ملڻ بعد سنڌ جي انتظاميه هلائڻ لائق ٿيندو هو.جڏهن سنڌ ۾ حجازي قبيلي نزاري ۽ يعني قبيلي قطاني جي وچ ۾ خانه جنگيءَ ٿي ته ان وقت سنڌ جو حاڪم عمران بن موسي برمڪيءَ قحطانين جي طرفداري ڪئي . جڏهن نزازبن جو اڳواڻ عمر بن عبدالعزيز هباري هو .۴۲۶هجري ۸۶۱ع ۾ عمر بن عبدالعزيز عمران بن موسي برمڪيءَ کي ماري وڌو.هن واقعي کان پوءِ هبارين جو سياسي اثر ايتري قدر قائم ٿي ويو جو عمران جي مرڻ بعد عنسبہ بن اسحاق ضبي جڏهن سنڌ جو حاڪم ٿي آيو .تہ عمر بن عبدالعزيز هباري جي طاقت کان متاثر ٿي هن جي مرضي سان هلڻ لڳو پر جڏهن ۲۳۵هجري ۾ هارون بن ابي خالد المروزي سنڌ جو والي ٿيو تہ هن سنڌ کي اڻ سڌي طرح عمر بن عبدالعزيز جي تابع ڏنو .ان کي برداشت نہ ڪيائين .نتيجي ۾ اختلاف وڌندا ويا.۲۴۰هجري مطابق ۸۵۵ع هارون ابي خالد

مارجي ويو.عمر بن عبدالعزيز هباري سنڌ ۾ پرپور طاقت حاصل ڪري چڪو هو .هن عباسي خليفي المتوڪل کان سنڌ جي حڪومت گهر ڪئي . عباسي خلافت جي ڪمزوري سبب متوڪل لاءِ ٻيو رستو نہ هو ۽ درخواست قبول ٿي . اهڙي طرح عمر بن عبدالعزيز هباري سنڌ تي هباري حڪومت جو بنياد وڌو.جيتو نيک اندروني طرح خودمختيار هو پر بغداد خليفي کي ڏن ڏيندو هو ۽ ملڪ ۾ عباسي خليفي جي نالي جو خطبو پڙهيو ويندو هو.

عمر بن عبدالعزيز هباري ۲۴۰-۲۵۵هجري مطابق ۸۵۵-۸۶۸ ع

عبدالله بن عمر جي حڪومت جي سنہ ،۲۸۰هجري ۾ خبر پوي ٿي .ان مان عمر بن عبدالعزيز جي حڪومت خاتمي ۽ عبدالله بن عمر جي حڪومت جي شروعات جو سن ۲۷۰هجري سمجهيو ويو آهي. جڏهن تہ زبير بن بڪار جهره انساب قريش ۾ لکي ٿيو تہ عمر بن عبدالعزيز هباري جي سنڌ تي حڪومت ،۲۴۰-۲۵۵, هجري تائين هئي . عمر بن عبدالعزيز هباري جا چاندي ۽ ٽامي جا سڪا ملن ٿا .سندس چاندي جا سڪا نيدا آ هن .جن تي هڪ طرف بالله بن عمر ولة النصر ٽن سٽن ۾ ٻئي طرف پنجن سٽن ۾ الله محمد رسول الله عمر لکيل آهي . ٽامي جي سڪن تي بہ ساڳي طرح لکيل آهي. اهي ماپ ۽ سائيز ۾ چاندي جي سڪن کان ڪجهه وڏيک آهن . ڪنهن بہ سڪي تي سنہ لکيل نہ مليو آهي

عبدالله بن عمر هباري ۲۵۵-۲۷۱هجري

عبدالله بن عمر پنهنجي پيءُ جي گذارڻ بعد ۲۵۵هجري ۾ سنڌ جو حاڪم ٿيو .هي بہ پنهنجي پيءُ وانگر منصوره جي ويجهو بانيہ ۾ رهندڙ هو . سندس حڪومت دوران بنو ڪنده جي آزاد ڪيل غلام ابوصمہ جي پٽ صمہ بغاوت ڪري منصوره تي قبضو ڪري ورتو.عبدالله بن عمر بانيہ ۾ هجڻ ڪري بانيہ پجي ويو ۽ فوج گڏ ڪري جلديءَ منصوره باغين کان ڇڏائي ورتو ۽ پوءِ بانيہ کي ڇڏي منصوره ۾ رهڻ لڳو.هي بہ پنهنجي پيءُ وانگر دلير ۽ مدبر حاڪم هو. سندس دور ۾ قرآن شريف جو پهريون ترجمو سنڌي زبان ۾ ٿيو .۲۸۰هجري کان پوءِ بہ عبدالله بن عمر جي حڪومت بابت احوال ملي ٿو پر علي بن عمر جو ۲۷۷هجري جو منصوره جو ضرب ڪيل سڪو ملڻ ۽ موسي بن عمر جا ۲۸۱هجري ۾ بغداد جي خليفي کي تحفا موڪلڻ ۽ منصوره جا حاڪم هجڻ جو ثبوت ملڻ بعد عبدالله بن عمر جي حڪومت وڌ ۾ وڌ ،۲۸۱ هجري تائين سمجهڻ کپي. سندس جاري ڪيل چاندي ۽ ٽامي جا سڪا منصوره پنپور ۽ سنڌ جي ڪيترن قديم آثارن مان مليا آهن .پر اها تائين ڪو بہ سن لڪيل سڪو هٿ نہ آيو آهي. چاندي جي هڪ نندي سڪي تي هڪ طرف محمد رسول الله الا ميرا عبدالله ٻي طرف لا الله ألا الله وحده لا شريك لہ لڪيل آهي چاندي جي هڪ ٻئي سڪي تي هڪ طرف بالله بن عبدالله والنصر ٻي طرف محمد رسول الله عبدالله لڪيل آهي اهڙي لکت وارا ٽامي جا سڪا بہ مليس آهن .پر هڪ ٽامي جو سڪو اهڙو بہ مليو آهي . جنهن جي وچ ۾ (عبد) ۽ (الله) هڪ ٻئي کي ڪٽيندا نظر اچي ٿا .چورس نموني ۾ الا مير محمد رسول الله لکيل آهي. ٻي طرف وچ ۾ چئن پنن وارو گل ۽ ان جي چوڌاري انداز ۾ الا الله الا الله وحده لا شريڪ لہ لڪيل آهي . جنهن جي چوڌاري هڪ گول ٻيڙين وارو دائرو ٺهيل آهي.

موسي بن عمر ۲۷۱هجري کان ۲۷۵هجري

۲۷۱هجري ۾ سنڌ جو حاڪم موسي بن عمر ٿيو . جنهن حڪومت هٿ ڪرڻ بعد جي خليفي المعتد علي الله ڏي ساڳئي سال تحفي طور هڪ تمام وڏو هاٿي .ٿي چاندي جا بت هڪ وڏو هرڻ ۽ مشڪ و عنبره موڪليا. ۲۷۱هجري کان پوءِ ۳۰۰ هجري تائين ڪوبہ احوال تصديق سان نتو ملي .۽ نہ هئي موسي بن عمر جو تاريخن ۾ ڪو احوال آهي .ان مان ظاهر آهي هن تمام ٿورو عرصو حڪومت ڪئي . موسي جي موسي جي حڪومت ۲۷۵هجري تائين سمجهڻ گهرجي ڇ.سندس نالي جو ڪوبہ سڪو اجا تائين نہ مليو آهي-

علي بن عمر ۲۷۵هجري کان ۲۸۰ هجري

هن علي بن عمر بابت بہ تاريخي ڪتاب ۾ ذڪر نہ آهي . عربن سنڌ ۾ دارالحڪومت منصوره ڪان ڪجهہ سڪا لڌا آهن . جيڪي چاندي جا آهن .هڪ ننڍو سڪو جنهن جي هڪ طرف باالله بنو علي ولة النصر ۽ ٻئي طرف محمد رسول الله علي لکيل آهي هي سڪو سنڌ ۾ ضرب ڪيو ويو آهي پر ضرب خاني جو نالو ۽ سنہ لکيل نہ اٿس . ٻيو سڪو جيڪو هڪ درهم (چاندي جو سڪو) آهي ان جي هڪ طرف گول دائري ۾ النصر والظفرالا مير علي بن عمر ان جي چوڌاري ضرب هذا الدرهم بعدينتہ النضوره سنة سبع و سبعين و ماۂتين لکيل آهي هن سڪا تي لکيل آهي تہ فتح ۽ ڪامراني امير علي پٽ عمر لاءِ آهي هي سڪو ضرب ڪيو . منصوره جي شهر ۾ سنہ ٢٧٧هجري ۾ هن جي نالي۾ ظاهر آهي تہ هي هباري امير هوندو.جنهن جي سڄيءَ سنڌ ۽ منصوره تي حڪومت هي .سڪي تي خليفي جي نالي نہ هجڻ سان اهو بہ معلوم ٿئي ٿو تہ هي سنڌ جو خودمختيار حاڪم هو سنڌ جي مختلف جاين تان سندس نالي جا ٿامي جا سڪا پڻ لڌا آهن .سندس حڪومت گهڻا سال رهي ان بابت پڪ سان ڪجهہ بہ نٿو چئي سگهجي.

اتم بن ....؟٢٨٠هجري ڪان ٢٨٥هجري

منصوره جي قديم آثارن مان چاندي جا ننڍا سڪا اهڙ ا بہ لڌا آهن جن جي هڪ طرف باالله بنو حاتم وله النصر ٻي طرف محمد رسول الله عمر لکيل آهي . هباري حڪمران بنو عمر سڏيا هيا .ان ڪري ڪيترا حاڪم پنهنجي سڪي تي بنو عمر ضرور لکندا هئا هي ڪنهن جو پٽ هو ان لاءِ پڪ سان ڪجهہ بہ نٿو چئي سگهجي .حاتم جي حڪومت ڪڏهن هي سن بابت چاڻ بہ ملي نہ سگهي آهي .سڪي تي ڪوبہ سن لکيل نہ آهي پر سڪي جي بناوٽ ۽ لکٽي علي بن عمر جي ننڍي سڪي جهڙي آهي ان لاءِ چئي سگهجي ٿو تہ هي ان ڪان پوءِ حاڪم ٿيو هوندو

عبدالر من بن ....؟٢٨٥ هجري ڪان ٢٩٤هجري

اج تائين ڪنهن بہ هباري حاڪم عبدالرحمان بابت خبر نہ پئي آهي ۽ نہ هي اهو نالو هباري حڪمران جي حيثيت سان ڪنهن ڪتاب۾ چاڻايو ويو آهي .پر منصوره ۽ سنڌ جي ٻين قديم آثارن مان ڪجهہ سڪا مليا آهن .جن جي پڙهڻ ۽ سمجهڻ سان خبر پوي ٿي تہ عباسي خليفي المتفي باالله جي دؤر حڪومت ۾ منصوره جو حاڪم عبدالرحمان هو جهن جي خطبي ۽ سڪي ۾ عباسي خليفي جو نالو استعمال ٿيندو هو .هي ڪنهن جو پٽ هو ان بابت ڪا بہ چاڻ ملي نہ سگهي آهي.هڪ چاندي جو درهم منصوره ۾ مان مليو آهي .جهن هڪ طرف گول دائري ۾ عبدالرحمن بأمر الأمام المتكتفى باالله ء چوداري ضرب هذا بمدينہ المنضور .... لکيل آهي .هن سڪا تي سن نہ لکيل آهي پر اهو پاسو ڪٽجي وڃاڻ سبب سنہ پڙهي نٿو سگهجي پر عباسي خليفي المڪتفي باالله جو دور حڪومت ٢٨٩هجري ڪان ٢٩٥هجري تائين وارؤ دور هن سڪا جي جاري ٿيڻ جو سن هوندو .هن سڪي جي ٻي طرف گول دائري ۾ ڪلمو لکيل آهي .علي بن عمر جي چاندي جي درهم ۽ هن سڪي جي بناوٽ لکٽي وزن هڪ جيترو آهي . عبدالرحمن جا ننڍا چاندي جا سڪا بہ سنڌ جي مختلف جاين تان مليا آهن .جن جي هڪ طرف باالله بنو عبدالرحمان النصر ۽ ٻئي طرف محمد رسول الله عبدالرحمان لکيل آهي .ان ڪان سواءِ ٿامي جا سڪا ٻن ماپن ۽ سائيز جا هڪڙا ننڍا ۽ ٻيا وڏا بہ ملن ٿا جيڪي خوبصورتي ۽ بناوٽ ۾ پنهنجو مثال پاڻ آهن .هڪ طرف ٻڙين ليڪن سان ٿهيل خوبصورت ڪنداتي ۽ اڌ گولاين واري ڏيرايين باالله عبدالرحمان يستعن جنهن جي معني ٿيندي واسطي الله جي عبدالرحمان مدد گهري ٿو ٻي طرف ٻڙين ۽ گول دائري ۾ چين پنن وارو گل ۽ ان جي چوڌاري محمد رسول الله عبدالرحمان لکيل آهي .سندس سڪن جي بناوٽ ڪاريگري ۽ ڊيزائن مان ثابت ٿو تہ اهو باصلاحيت ۽ باذوق حاڪم ٿي گذريو آهي

محمد بن عبدالر من ٢٩٤هجري ڪان ٣٠٠هجري

محمد بن عبدالرحمان متعلق بہ هن ڪان اڳ ڪابہ چاڻ ملي نہ سگهي آهي.سندس نالي جو هڪ چاندي جو سڪو مليو آهي جنهن جي هڪ طرف باالله بنو محمد النصر ۽ ٻئي پاسي محمد رسول الله ۽ ٽن پنن وارو

گل ٺهيل آهي .ان کان سواءِ ٽامي جا سڪا عبدالرحمان جي سڪن جهڙا پر هنن تي عبدالرحمن جي بدران محمد لکيل آهي .مليا آهن .پر ڀنڀور جي کوٽائي دوران هڪ عمارت مان جنهن کي مسجد ثابت ڪيو ويو آهي.مليل پٿر جي هڪ ڪتبي تي لکيل عبارت کي پڙهڻ سان اسان کي محمد جي پي جو نالو سندس دور حڪومت جو ڏس ملي ٿو .ڪتبي تي لکيل گلن واري ڪوفي رسم الخط جي عبارت ۾ بسم الله ڪلمي ۽ قرآني آيت بعد امير محمد عبدالر..............جي حڪم سان ۲۹۴هجري ۾ هن پٿر جي نصب ٿيڻ جو ذڪر آهي .هن ڪتبي ۾ محمد بن عبدالر........ اهي تصوير پنڀور جو ڪتبو پٿر پڇي پوڻ سبب نالي جو اڌ حصو پڙهي نٿو سگهي . جڏهن ته محترم ڊاڪٽر عبدالغفور صاحب ان کي محمد بن عبدالله ڪري پڙهيو آهي . منهنجي خيال۾ اهو ڪتبو سنڌ جي هباري امير محمد عبدالرحمن جو آهي . جنهن جو تختگاهه منصوره هو پر سموري سند سان گڏ پنڀور جو علائقو به سندس حڪومت ۾ شامل ٿيو .اهو پنهنجي پيءُ عبدالرحمان جي گذارڻ بعد ۲۹۴هجري ۾ سند جو حاڪم ٿيو.۽ پنهنجي حڪومت جي پهرين سال تعميراتي ڪم شروع ڪري يادگار طور پٿر نصب ڪيائين سندس ٽامي جا سڪا منصوره ۽ سنڌ جي ٻين به ڪيترن قديم آثارن مان ملن ٿا.

عمر بن عبدالله ۳۰۰کان ۳۳۰هجري

سنه ۳۰۳هجري ۾ جڏهن مسعودي ۾ آيو ته هن عمر بن عبدالله کي سنڌ جو حاڪم ڏٺو . سندس پورو نالو ابوالمنذر عمر بن عبدالله هباري هو . سنڌ جي مختلف حصن مان عمر بن عبدالله جي نالي جا چاندي ۽ ٽامي جا سڪا مليا آهن.. سندس ٽامي جي سڪن تي نالي سان گڏ ابوالمنذر پڻ نظر اچي ٿو.سندس ڪنهن به سڪي تي اچا تائين سنه لکيل نه مليو آهي . جنهن مان سندس دور حڪومت جو تعين ڪري سگهجي . مسعودي جي بيان مان سندس ٻن پٽن محمد بن عمر ۽ علي بن عمر جي خبر پوي ٿي.جيڪي اڳتي هلي سنڌ جا حاڪم ٿيا.

محمد بن عمر ۳۳۰هجري کان ۳۶۰هجري

محمد بن عمر پنهنجي پيءُ جي وفات کان پوءِ سنڌ جو حاڪم ٿيو .هن بابت به ڪو تاريخي ثبوت نٿو ملي . سواءِ ان جو مسعودي هن کي سندس پيءُ عمر بن عبدالله جي دربار۾ ڏٺو. ان بعد ۴۰۱هجري کان ۴۱۶هجري تائين سنڌ جو حاڪم خفيف نظر اچي ٿو . جنهن جي باري۾پڪ نٿو چئي سگهجي ته هو ڪير هو .ڪي تاريخ دان هن کي سومرن جو پهريون حاڪم ۽ ڪي آخري هباري طور تسليم ڪن ٿا . سندس نالي جو ڪو به سڪو سنڌ جي ڪنهن به حصي مان اچا نه لڌو آهي . جنهن جي آڌار تي ڪا پڪي راء قائم ڪري سگهجي . هباري حڪمرانن جي شان و شوڪت سندن وسايل شهرن ۽ عرب طاقت کي محمود غزنوي تباه ڪندو هڪ طو فان وانگر هليو ويو . جنهن جا آثار اڄ به منصوره جي کوٽائي مان ظاهر ٿيا آهن . جتان کوٽائي ڪندي محڪمه آثار قديم جي ماهرن کي گهر نمبر ۴ مان سڙيل ٽانو گهر جي ڇت جو سڙيل ڪاٺ ۽ ماڻهن جا هڏا آهن هبارين جي مليل سمورن سڪن جي لکت عربي ڪوفي رسم الخط ۾ آهي .جن مان اڪثر تي سنه موجود نه آهي .اڄ تائين هبارين جو ڪو به سونو سڪو هٿ نه آيو سنڌ جي هباري حڪمران بابت جيتوڻيڪ ڪجهه ڄاڻ نون حاڪمن ۽ سندن دور حڪومت بابت مختلف لکڻين سڪن ۽ ڪتبن وسيلي ملي آهي .پر اڃا تائين به سنڌ جي تاريخ جو هي دور تحقيق طلب آهي .مڪمن آهي ته هيستائين مليل حاڪمن جي نالن کان پوءِ ٻيا حاڪم به ٿي گذريا هجن.جن بابت اڃا ڪو به ثبوت نه مليو آهي . حاڪمن جي مليل نالن مان ڪن جي حڪومت جا سنه صحيح ۽ پڪ وارا نه آهن . جيڪي اميد آهي ته جلد سنڌ جي قديم آثارن جي کوٽائي مان ملندڙ سڪن ۽ ڪتبن ۽ ٻين پڪ وارين شاهدين وسيلي حاصل ڪري سگهبا ۽ سنڌ جي تاريخ جي هن اهم باب متعلق هر اختلافي مسلو صحيح نموني حل ٿي سگهندؤ . جيستائين اسان کي ٻيو ڪو به ثبوت هن ثبوت هن دور جي تاريخ متعلق نٿو ملي تيسين اسان مٿي ڏنل ثبوتن جي آڌار تي هباري حڪمرانن جي لسٽ ترتيب ڏيڻي پوندي جيڪا اڳتي سڀني لسٽن کان وڌيڪ پڪي پختي ۽ اعتبار جوڳي آهي. عمر بن

عبدالعزيز هباري ۲۴۰ هجري ۔۲۵۵هجري ۸۵۵۔ ۸۶۸ع عبدالله بن عمر هباري ۲۵۵هجري۔ ۲۷۱هجري۸۶۹۔۸۸۴ع موسي بن عمر هباري ۲۷۱هجري۔۲۷۵هجري۸۸۴۔۸۸۸ع علي بن عمر هباري ۲۷۵هجري۔۲۸۰هجري ۸۸۸۔۸۹۳ع حاتم بن عمر هباري ۲۸۰هجري۔۲۸۵هجري۸۹۳۔۸۹۵ع عبدالرحمن بن عمر هباري ۲۸۵هجري۔ ۲۹۴هجري۸۹۸۔۹۰۸ع محمد بن عبدالرحمان هباري ۲۹۵۔۳۰۰هجري۹۰۸۔۹۱۳ع ابوالمنذر عمر بن عبدالله هباري ۳۰۰هجري۔۳۳۰هجري۹۱۳۔۹۴۲ع محمد بن عمر ۳۳۰هجري۔۳۶۰هجري ۹۴۲۔۹۷۱ع علي بن عمر هباري ۳۶۰هجري۔۳۷۵هجري۹۷۱۔ ۹۸۵ع يحي بن عمر ۳۷۵هجري۔۳۸۰هجري ۹۸۵۔ ۹۹۰ع احمد بن .....؟هباري ۳۸۰هجري۔۴۰۱هجري ۹۹۰۔۱۰۱۱ع

۱۹۸۳ء میں منصورہ کے آثار پر سانگھڑ ہسٹار کل اینڈ کلچر سوسائٹی کی جانب سے ایک بڑا سیمنار منعقد کیا گیاجس کا افتتاح اس کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل ایس ایم عباسی گورنر سندھ نے کیا ۔اس سیمنار میں ملک کے مایہ ناز ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں نے اپنے مقالے پڑھے ۔جن میں ڈاکٹر لوینر فلیم ، ڈاکٹر ایف اے خان ۔ڈاکٹر رفیق احمد مغل ۔ڈاکٹر اشتیاق الرحمٰن ۔ڈاکٹرنبی بخش بلوچ اور دیگر ماھرین نے اپنے مقالے پڑھے۔ ۱۹۹۲ءمیں سیمنار میں پڑھے گے مقالہ کو ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔یہ کتاب سندھی زبان میں شائع کی گی ۔میرا زیر ترجمہ مقالہ عبداللہ خان وریا مرحوم کا ہے جس کانام ہے ''منصورہ کے حکمران سکوں کی روشنی میں ''۔

اس مقالہ کی اھمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس کی تصنیف کے وقت تک منصورہ سے دریافت ہونے والوں سکوں پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا ۔ اس مقالہ میں چند سکے بھی متعارف کرائے گئے ہیں جو بہت نایاب ہیں ۔اس طرح کے سکہ آج تک دریافت نہیں ھوسکے ۔مرحوم نے اس سکوں کی تحریر کو پڑھ کر ھباری حکمرانوں کی ایک مکمل فہرست تیار کرنے کی کوشش ہے۔ عبداللہ خان وریا نے اپنے مقالہ میں جن سکوں کا ذکر کیا ہے کان کی تصاویر مذکورہ بالا کتاب میں موجود نہیں ہیں ۔ترجمہ میں جو سکوں کی تصاویر میری کولیکشن سے لی گئی ہیں۔

اردو ترجمہ

منصورہ کے حکمران سکوں کی روشنی میں

سندھ کی تاریخ کے کئی ادوار ابھی تک اندھیرے میں ہیں جن کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں یا پھران کے متعلق بہت کم اور نامکمل معلومات مل سکی ہے ۔جب کہ ہمیں ان ادوار کی مکمل اور درست تاریخ ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔اس بات کی ضرورت ہے کہ اس بارے میں مکمل تحقیق اور سندھ کے قدیم آثار اور کھنڈرات کی مکمل کھدائی کر کے ان سے ملنے والے نوادرات کی مکمل تحقیقات کی روشنی میں سندھ کی تاریخ تحریر کی جائے اور پرانے حوالہ جات اور من گھڑت روایات کو جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں درست کیا جاسکے ۔تاکہ ہم بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اپنی تاریخ پر فخر اوراسے مکمل تحقیقات کے ساتھ پیش کر سکیں۔

میرے اس مقالہ میں سندھ کے ھباری حکمرانوں کے سکوں اور کتبوں کی بنیاد پر ان کی حکمرانی کے ادوار مقرر کیے گئے ہیں اور کچھ نئے حکمرانوں کے نام بھی ظاہر کئے گئے ہیں جن کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہوسکیں۔ میری اس مقالہ میں یہ کوشش رہے گی کہ میں اپنی تحقیق مکمل شواہد کی بنیاد پر آپ کے سامنے پیش کرسکوں۔

سندھ عربوں کے ہاتھوں فتح ہونے کے بعد اسلامی خلافت میں شامل کیا گیا۔اور یہاں پر حکومت چلانے کے لیے اموی اور عباسی خلفاء امیر مقرر کرتے تھے جو یہاں کے معلامات چلاتے۔وہ ان کی مدد کے لئے سامان رسد اور فوج بھی بھیجتے تھے۔جب یہاں مکمل امن وامان اور حکومت مستحکم ہوگئی تو عربوں نے پرانے اور نئے شہر آباد کرکے ان میں عرب قبائل کو آباد کیا۔ان شہروں میں اڑور۔دبیل۔نیرون۔ملتان۔بیضار۔بانیہ۔محفوظ اور منصورہ قابل ذکر ہیں۔سندھ میں آباد ہونے والے حجاز کے قریشی قبیلے ھباری نے جو مرتبہ حاصل کیا اور اپنی ہمت، قابلیت اور طاقت سے جو خود مختار حکومت قائم کی اس کی مثال ملنی مشکل ہے

اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک (105-125ہجری مطابق 724-744ع) کی طرف سے 112ہجری میں الحکم بن عوانہ کو سندھ کا حکمران مقرر کرکے ایک بڑے لشکر کے ساتھ سندھ روانہ کیا گیا تو اس کے ساتھ محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو کے علاوہ ایک شخص تھا اس کا نام مندر بن زبیر تھا اور جو عراق کے شہر بصرہ کا رہنے والا تھا۔وہ سندھ میں بانیہ شہر میں رہائش پذیر ہوا جو کہ منصورہ شہر سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔

وہ عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح کے وقت میں قرقیسیا شہر چلا گیا وہاں پر بغاوت اور باغیوں کا ساتھ دینے کے جرم میں قتل کردیا گیا۔لیکن اس کے خاندان کے افراد اور اس کا بیٹا عبدالعزیز بن مندر بانیہ شہر میں ہی قیام پذیر رہے، عبدالعزیز بن مندر کا شجرہ اس طرح ہے۔

عبدالعزیز بن مندر بن زبیر بن عبدالرحمن بن ھبار بن اسود

یہ دادا کی نسبت سے ھباری کے نام سے مشہور ہوئے۔ھباری خاندان کے افراد اموی اور عباسی خلافت کے دور میں حکومت کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔اور آگے جاکر سندھ میں آباد حجازی قبیلہ عمر بن عبدالعزیز ھباری کی قیادت میں جمع ہوگئے۔ عمر بن عبدالعزیز ھباری نے سندھ میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیا۔نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عباسی خلیفہ کا مقرر کردہ کوئی بھی امیر سندھ میں عمر بن عبدالعزیز ھباری کی حمایت کے بعد ہی حکومت کرسکتا تھا۔جب سندھ میں حجازی نزاری اور قحطانی قبائل کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس وقت سندھ کے امیر عمران بن موسیٰ البرمکی نے قحطانی قبیلہ کی حمایت کی جبکہ نزاری قبیلہ کی قیادت عمر بن عبدالعزیز ھباری کے ہاتھ میں تھی ۔اس جنگ میں عمران بن موسیٰ مارا گیا۔عمران بن موسیٰ کے بعد عنبسہ بن اسحاق سندھ کا امیر مقرر ہوکر آیا اور عمر بن عبدالعزیز ھباری کے ساتھ مل کر حکومت کرنے لگا جب 235ہجری میں ہارون بن ابی خالد المروزی سندھ کا امیر مقرر ہوکر آیا تو اس کا عمر بن عبدالعزیز ھباری سے اختلاف واقع ہوگیا۔اس اختلاف کے نتیجے میں 240ہجری میں ہارون بن ابی خالد مارا گیا۔اس وقت تک عمر بن عبدالعزیز ھباری سندھ میں مکمل طور پر اپنی پوزیشن مستحکم کرچکا تھا۔اب عمر بن عبدالعزیز ھباری نے عباسی خلیفہ المتوکل سے سندھ کی حکومت طلب کی۔عباسی خلیفہ کے پاس اپنی کمزور پوزیشن کی وجہ سے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس کا مطالبہ تسلیم کرلے ۔ اس نے عمر بن عبدالعزیز ھباری کی درخواست قبول کرلی ۔اس طرح عمر بن عبدالعزیز ھباری نے سندھ میں ھباری حکومت کی بنیاد رکھی۔

عمر بن عبدالعزیز ھباری سندھ میں حکومت کرنے کے لیے آزاد تھا لیکن اسے عباسی خلیفہ کو خراج ادا کرنا اور جمعہ کے خطبہ میں عباسی خلیفہ کا نام لینا پڑتا تھا۔عبداللہ بن عمر ھباری کی حکومت 280 ہجری شروع ھوتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ھے کہ عمر بن عبدالعزیز ھباری کی حکومت 280ہجری میں ختم ہوئی اور اس کے بعد عبداللہ بن عمر کی حکومت شروع ہوئی۔زبیر بن بکار جمہرہ انساب قریش میں لکھتا ہے کہ آج کل سندھ میں عمر کی اولاد حاکم ہے۔اس سے ظاہر ھوتا ھے کہ عمر بن عبدالعزیز ھباری کی سندھ حکومت 240ہجری سے 255 ہجری تک تھی۔عمر بن عبدالعزیز ھباری کے چاندی اور تانبے کے سکہ ملتے ہیں۔

چاندی کے سکہ چھوٹے ہوتے ہیں جس کے ایک طرف "باللہ بن عمر ولہ النصر" اور دوسری طرف پانچ سطروں میں "للہ۔محمد۔رسول۔اللہ۔عمر" تحریر ہے۔تانبے کا سکوں پر بھی یہی تحریر ہے۔تانبے کے سکے چاندی کے سکوں سے بڑے ہے۔کسی بھی سکوں پر سن تحریر نہیں ہے۔(عمر بن

عبدالعزیز ھباری کے چاندی کے ایسے سکے بھی ملے ہیں جن پر عباسی خلیفہ المستنصر کا نام ضرب ہے۔

عبداللہ بن عمر 255ہجری -271ہجری

عبداللہ بن عمر اپنے والد کے انتقال کے 255ہجری میں سندھ کے حکمران بنا۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح منصورہ کی قریبی شہر بانیہ میں رہائش پذیر تھا۔ عبداللہ بن عمر کے دور میں بنو کندہ کے ایک آزاد کردہ غلام ابوصمہ کے بیٹے صمہ نے بغاوت کر کے دارالحکومت منصورہ پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ بن عمر بانیہ سے آکر منصورہ کو باغیوں سے آزاد کر کیا۔ اور مستقل طور پر منصورہ میں رہائش پذیر ہو گیا۔ یہ والد کی طرح بہادر اور مدبر حکمران تھا۔ اس کے دور میں قرآن شریف کا سندھی زبان میں ترجمہ ہوا۔ 270ہجری کے بعد عبداللہ بن عمر کی حکومت کے احوال ملتے ہیں۔ لیکن علی بن عمر کا 277ہجری کا ضرب کیا ہوا سکہ منصورہ سے ملتا ہے اور موسیٰ بن عمر کا بغداد کے خلیفہ کو 271 ہجری میں تحائف بھیجنے کا ذکر ملتا ہے۔ اس ذکر کی روشنی میں عبداللہ بن عمر کا دور حکومت زیادہ سے زیادہ 271ہجری تک ممتد سمجھا جا سکتا ہے۔ عبداللہ بن عمر کے جاری کردہ سکے منصورہ، دیبل اور دیگر قدیم آثار سے ملتے ہیں لیکن ان سکوں میں سے کسی پر سن ضرب موجود نہیں ہے۔

عبداللہ بن عمر کے ایک چاندی ایک سکہ کے طرف محمد رسول اللہ الامیر عبداللہ اور دوسری طرف "لا اللہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ" ضرب ہے۔ ایک دوسرے سکے پر "باللہ　بن عبداللہ وانصر" اور دوسری طرف" محمد رسول اللہ عبداللہ" ضرب ہے۔

اسی طرح کے تابنے کے سکے بھی ملتے ہیں ایک تابنے کا ایسا سکہ بھی ملا ہے جس کے درمیان میں "عبد" کا لفظ اور "اللہ" کا لفظ ایک دوسرے سے کاٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔۔ اور اس کے ساتھ میں الامیر محمد اور رسول اللہ کے الفاظ ضرب ہیں جبکہ دوسری طرف سکہ کے درمیان میں پھول کی پتیاں اور اس کے برابر میں "الا اللہ الا اللہ وحدہ لا شریک شریک لا" تحریر ہے اور اس کے برابر ایک گول دائرہ بنا ہوا ہے۔

موسی بن عمر 271 ہجری سے 275 ہجری

271 ہجری میں سندھ کا حاکم موسی بن عمر بنا۔ موسی بن عمر نے حکومت سنبھالتے ہی عباسی خلیفہ المعتمد کو تحفے کے طور پر ایک بڑا ہاتھی تین چاندی کے مجسمے ایک بڑا اہرن اور مشک و عنبر بھیجے۔

271 ہجری سے 300 ہجری تک کوی بھی تاریخی واقعات نہیں ملتے۔ اور نہ ہی موسی بن عمر کے متعلق کوئی حوالہ ملتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بہت کم عرصہ حکومت کی۔ موسی کی حکومت 275 ہجری تک سمجھنا چاہیے۔ موسی بن عمر کا ابھی تک کوئی سکہ نہیں ملا۔

علی بن عمر 275 ہجری سے 280 ہجری

علی بن عمر سے متعلق کیسی بھی تاریخی کتابوں کوی بھی ذکر نہیں ملتا۔ عربوں کے درالحکومت منصورہ سے چاندی کا ایک چھوٹا سکہ ملا ہے جس کی ایک طرف "باالله بنو علی ولہ النصر" اور دوسری طرف "محمد رسول الله اور علی" ضرب ہے۔ یہ سکہ سندھ میں ضرب ہوا ہے۔ سکہ پر سن ضرب موجود نہیں ہے۔ ایک اور چاندی کا درھم ملا ہے جس کے ایک طرف گول دائرے میں "النصر والظفر الامیر علی بن عمر" اور اس کے گول دائرے میں ضرب "هذا الدرهم بعد ينته المنصور سنته سبع و ستعين ومائتين" تحریر ہے۔ اور دوسری طرف "الا الله آلا محمد رسول الله" ضرب ہے۔ اس سکہ پر تحریر ہے کہ فتح وکامرانی امیر علی بیٹے عمر کے لیے اور یہ سکہ ضرب ہوا ہے منصورہ شہر میں 277 ہجری میں۔ اس نام اور سن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علی ایک ھباری حکمران تھا جس نے سندھ اور منصورہ پر حکومت کی۔ سکہ پر خلیفہ کا نام نہ ہونے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ نے اس وقت خود مختار حاصل کرلی تھی۔ علی بن عمر کے تابنے کے سکے بھی ملے ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس نے کتنے برس حکومت کی۔

حاتم بن۔ 280 ہجری سے 285 ہجری

منصورہ کے آثار سے چاندی کے ایسے چھوٹے سکے بھی ملے ہے جن کی ایک طرف "بالله بنو حاتم ولہ النصر" اور دوسری طرف "محمد رسول الله اور عمر" تحریر ہے۔ ھباری حکمران خود کو بنو عمر کہلاتے تھے۔ اس لئے کئ حکمرانوں نے اپنے سکوں پر بنو عمر ضرب کروایا۔ حاتم کی حکومت کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملی۔ اس کے سکوں پر اگرچہ سن ضرب موجود نہیں لیکن ان کی بناوٹ اور تحریر کا انداز علی بن عمر کے چھوٹے سکے جیسا ہے۔ اس سے ہم یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ علی بن عمر کے بعد سندھ کا حکمران بنا۔

عبدالرحمن بن۔۔۔؟ 285 ہجری سے 294 ہجری

ابھی تک کسی عبدالرحمن نامی ھباری حاکم کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہوسکیں اور نہ ہی عبدالرحمن نامی کسی ھباری حکمران کا نام کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن منصورہ اور سندھ کے دوسرے قدیم آثار سے کچھ سکے ایسے ملے ہیں جن کی تحریر پڑھنے یہ معلومات ملتی ہیں کہ عباسی خلیفہ المکتفی باللہ کے دور حکومت (289 ہجری سے 295 ہجری) میں منصورہ کا حاکم عبدالرحمن تھا جس کے دور حکومت میں عباسی خلیفہ کا خطبہ میں نام اور سکہ میں استعمال ھوتا تھا۔ لیکن یہ کس کا بیٹا تھا اس بارے میں کوئی معلومات نہیں۔ ایک چاندی کا درھم ملا ہے۔ جس کے ایک طرف گول دائرے میں "عبدالرحمن بامر الامام المکتفی باللہ" اور چاروں طرف ضرب" ھذاالدرھم بمدینہ المنصورہ" درج ہے۔

اس سکہ میں سن ضرب نہیں ہے اس سکہ کا ایک کونے ٹوٹ جانے کی وجہ تحریر مکمل پڑھی نہیں جاسکتی۔ عباسی خلیفہ المکتفی باللہ کا دور حکومت 289 ہجری سے 295 ہجری تک ممتد ہے۔ اس دوران یہ سکہ ضرب ہوا

ہے۔ اس کے دوسری جانب دائرے میں کلمہ طیبہ ضرب ہے۔ علی بن عمر کے چاندی کے درھم اور اس سکہ کی بناوٹ۔ طرز تحریر اور وزن یکساں ہے۔

عبدالرحمن کے چھوٹے سکے بھی ملتے ہیں۔ جن کی ایک طرف " باللہ بنو عبدالرحمن النصر" اور دوسری طرف " محمد رسول اللہ اور عبدالرحمن" ضرب ہے۔ اس کے علاوہ تابنے کے چھوٹے بڑے سکے بھی ملتے ہیں جو بہت خوبصورت ہیں۔ ان سکوں میں ایک طرف گول دائرے میں نقطے کے ڈیزائن میں "باللہ عبدالرحمن یُ ستعین "(میں واسطے اللہ عبدالرحمن مدد چاھتاہوں) دوسری طرف گول دائرے میں چار پھولوں کی پتیوں کا ڈیزائن اور اس کے چاروں طرف یہ تحریر ضرب ہے " محمد رسول اللہ" جس کے ساتھ ہی عبدالرحمن " بھی لکھاہے۔

محمد بن عبدالرحمن بن 294 ہجری سے 300 ہجری

محمد بن عبدالرحمن سے متعلق پہلے کوی معلومات نہیں ملتی۔ لیکن آثار سے ایک چھوٹا سکہ ملا جس کے ایک طرف "باللہ محمد النصر" اور دوسری طرف " محمد رسول اللہ" اور تین پتوں والا پھول کا نشان ضرب ہے اس کے لیے عبدالرحمن جیسے تانبے کے سکہ ملتے ہیں جن پر عبدالرحمن کے بجائے محمد کا نام ضرب ہے۔ ان کسی بھی پر اس کے والد اور سن ضرب نہیں ہے۔

بھنبھور کے آثار کی کھدائی سے دریافت ہونے والے مسجد کے آثار سے ایک کتبہ دریافت ہوا ہے۔ اس پر محمد بن عبدالرحمٰن کے والد کا نام اور سن تحریر ہے۔ اس کتبہ پر بسم اللہ اور کلمہ طیبہ کے بعد یہ عبارت تحریر ہے:

"

امیر محمد عبدالر[-------] کے حکم سے 294 ہجری

اس عبارت میں شاید کتبے کے مسجد میں نصب ہونے کا ذکر ہے۔ کتبہ میں محمد عبدالر[-------] تحریر ہے کتبہ ٹوٹا ہونے کی وجہ سے آدھا حصہ ہی پڑھا جاسکا۔ اس تحریر کو محترم ڈاکٹر عبدالغفور صاحب نے محمد بن عبداللہ کے طور پر پڑھا ہے۔ میرے خیال سے یہ کتبہ سندھ کے ھباری حکمران امیر محمد بن عبدالرحمن کا ہے جس کی حکومت منصورہ کے ساتھ ساتھ سارے سندھ اور بھنبھور پر بھی تھی ۔یہ اپنے والد عبدالرحمن کے انتقال کے بعد 294 ہجری میں حکمران بنا۔ اور اپنی حکومت کے پہلے سال ہی تعمیراتی کام شروع کیے اور یہ کتبہ نصب کریا۔ محمد بن عبدالرحمن کے تابنے کے سکے

منصورہ اور بھنبھور کے علاوہ سندھ کے دوسرے آثاریاتی مقامات پر بھی ملتے ہیں۔

عمر بن عبداللہ 300 ہجری سے 330 ہجری

303 ہجری میں جب مسعودی سندھ آیا تو عمر بن عبداللہ سندھ کا حاکم تھا۔ اس کا پورا نام ابوالمنذر بن عبداللہ ھباری ہے۔ سندھ کے مختلف آثار سے عمر بن عبداللہ کے نام کے چاندی اور تابنے کے سکے ملے ہیں۔ اس کے تابنے کے سکوں پر نام کے ساتھ "ابوالمنذز" بھی نظر آتا ہے۔ اس حکمران کے سکوں پر سن ضرب درج نہیں ہے جس کی مدد سے میں اس کے دور حکومت کا تعین کر سکوں۔ مسعودی کے بیان کے مطابق عمر بن عبداللہ کے دو بیٹے عمر اور علی کی معلومات ملتی ہے۔ جو آگے چل کر سندھ کے حکمران بن

محمد بن عمر (330 ہجری سے 360 ہجری)

محمد بن عمر اپنے والد کے انتقال کے بعد سندھ کا حکمران بنا۔ اسکے متعلق کوئی تاریخی حوالہ یا ثبوت نہیں سوائے مسعودی کے اس بیان کے جو اس نے عمر بن عبداللہ کے دربار میں دیا۔

اس کے بعد 401 ہجری سے 416 ہجری تک سندھ کے حاکم خفیف کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بارے میں مستند طور پر کچھ نہیں کہے سکتے کہ وہ کون تھا ؟

کچھ تاریخ دان اس کو سومرو خاندان کا پہلا حکمران اور کچھ ھباری خاندان کا آخری حکمران کہتے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی سکہ نہیں ملا جس کی بیناد پر یہ رائے قائم ہو سکتی ہے۔ محمود غزنوی ھباری حکمرانوں کی شان و شوکت کے آباد شہروں اور عربوں کی طاقت کو تباہ و برباد کر کے ایک طوفان کی طرح چلا گیا۔ جس کے آثار ہمیں منصورہ کے کھدائی سے ملتے ہیں۔ کھدائی کے دوران ماہرین آثار قدیمہ کو گھر نمبر 4 سے جلے ہوئے برتن، گھر کی جلی ہوئی چھت کی لکڑی۔ اور انسانوں کی ہڈیاں ملی ہیں۔

ھباری حکمرانوں کے جو بھی سکے ملے ہیں ان کا رسم الخط خط کوفی ہے اور جن کی اکثریت سن ضرب موجود نہیں ہے۔ ابھی تک ھباری حکمرانوں کا کوئی بھی سونے کا سکہ دریافت نہیں ہوا۔ سندھ کے ھباری حکمرانوں سے متعلق جو کچھ معلومات موجود ہیں وہ مختلف تحریروں سکوں اور کتبوں سے ملی ہیں۔ اس بارے میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت باقی ہے۔ عین ممکن ہے کہا بھی تک جن حکمرانوں کے نام ملے ہے ان کے علاوہ اور حکمران بھی ہو گزرے ہوں جن سے متعلق ابھی تک کوئی ثبوت نہیں ملے۔ ابھی تک جو

بھی نام ملے ہیں ان کا حکومت کرنے کا عرصہ مصدقہ نہیں ہے۔امید ہے کہ آئندہ مزید ہونے والی کھدائیوں سے ملنے والے سکوں، کتبوں اور دوسرے نوادرات سے تاریخ کے مزید اہم باب کھولے جاسکیں گے۔جب تک ہمیں مزید ثبوت نہیں ملتے اس وقت تک ہمیں اوپر دیے گئے ثبوت کی بنیاد پر ھباری حکمرانوں کی ایک ایسی فہرست ترتیب دینی پڑی گیجو آگے چل کر مندرجہ ذیل ھباری حکمرانوں کی ایک قابل اعتبار فہرست مرتب کرنے کے لئے قابلِ اعتبار قرار پاسکے۔

۱	عمر بن عبد العزیز ھباری	240-255 ہجری	855-868عیسوی
۲	عبداللہ بن عمر ھباری	255-271ہجری	869-884عیسوی
۳	موسی بن عمر ھباری	271-275ہجری	884-888عیسوی
۴	علی بن عمر ھباری	275-280ہجری	888-893عیسوی
۵	حاتم بن عمر ھباری	280-285ہجری	893-898عیسوی
۶	عبدالرحمن بن عمر ھباری	285-294ہجری	898-908عیسوی
۷	محمد بن عبدالرحمن ھباری	294-300ہجری	908-913عیسوی
۸	ابوالمنذز عمر بن عبداللہ ھباری	300-330ہجری	913-942عیسوی
۹	محمد بن عمر	330-360ہجری	942-971عیسوی
۱۰	علی بن عمر	360-375ہجری	971-985عیسوی
۱۱	یحیی بن عمر	375ہجری 380ہجری	985-990عیسوی
۱۲	احمد بن۔ھباری	380-401ہجری	990-1011عیسوی

Biological and Environmental Threats to Heritage: A case study of Sultan Mehmud Khurd Tomb at Guli Bagh, Mansehra, KP, Pakistan

Fazal Muhammad, Navid Ahmad, Sumbal Imtiaz, Waheed Alam

Department of Archaeology, Hazara University, Mansehra, Pakistan

ARTICLE INFO

ABSTRACT

***Keywords*:**
Guli Bagh
Sultan Mehmud Khan Tomb
Archaeology
Pakistan

Abstract

Biological and environmental agents are the most critical threats to the built heritage, especially to those monuments which are directly exposed to the sun and other chronic agents. The tomb of the last Sultan of Pakhli Mehmud Khurd is also facing such types of biological and environmental threats, containing frost action, insulation, rainfall, snowfall, evaporation, wind action, and growth of another organism like fungus and algae. These agents damage the structure and make weak the joints. This paper is an approach and the identification of these threats and negative impacts as observed in the Sultan Mehmud Khurd tomb at Guli Bagh, Mansehra.

کلیدی الفاظ:
گلی باغ
مقبرہ سلطان
محمود خان
آثاریات
مانسہرہ

خلاصہ: حیاتیاتی اور ماحولیاتی تبدیل کار تعمیراتی ورثے کے لئے اور بطور خاص اس تعمیراتی ورثے کے لئے سب سے بڑے خطرے کا درجہ رکھتے ہیں جسے سورج اور اس جیسے دیگر تبدیلی کاروں کے براہ راست اثرات پہنچ رہے ہوں۔ پکھلی کے آخری سلطان محمود خورد کو بھی اسی قسم کے حیاتیاتی اور ماحولیاتی خطرات کا سامنا ہے۔ ان خطرات میں انجمادی اثرات، انسولیشن، بارش، برفباری، بخاراتی تحرک، ہوا کے اثرات اور دوسرے اجسام کی نم جیسے کہ فنگس اور الجائی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تبدیلی کار عمارت کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اس کے جوڑ ڈھیلے کرتے رہتے ہیں۔ زیر نظر مضمون سلطان محمود کے مقبرے واقع گلی باغ مانسہرہ میں ان خطرات اور ان کے منفی اثرات کو پہچاننے کی ایک کوشش ہے۔

*Corresponding Author: walam0883@gmail.com

Introduction

The tomb of Mehmud Khurd is the unique standing monument of the Mughal period in the entire Hazara region, although this area has been a route of trade caravans, royal journeys for centuries. The said building is made of burnt bricks with lime mortar and plaster, whereas other buildings were made of naturally available stones (Khan 1976: 145; Shakirullah 2012: 139).

This important monument was constructed during the last decade of Shah Jahan. The monument is constructed on an open bare plain that is directly exposed to the sun and other chronic agents (Rehman 1988:245; Khan 1975: 216). This is facing severe biological and environmental threats, containing rainfall, snowfall, insulation, frost action, evaporation wind action, water penetration, another organism like the growth of fungus, algae, lichens, and bacteria as well as from wet and dry dust deposit are the main fears to build heritage. Similarly other environmental impacts in global warming and due to

other changing scenarios, this monument is in danger (Amoroso 1980: 3).

The said tomb building lies between 34˚44’654’ north longitude and 73˚18’208’ east latitude with an elevation of 890 meters above sea level. The elaborate works-man-ship of this conception has a great aesthetic value and perfection. The entire work was carried out with an eye to completeness for every part of the Guli Bagh region. It is square in plan 8.7× 8.7 m, with a 1.37 m thick wall. The backed bricks are of the reddish colour with five different sizes of 25.4 × 15.4 × 3.81 cm, 33 × 22.86×3.81 cm, 33 × 20 ×3.81cm, 45.72 cm × 22.86 × 3.81 cm, and 35.56 × 15.24 × 3.81 cm. The square chamber rises to a height of 4.8 m and a total height of the tomb along with the low squat dome reaches 6m., and its western part is strengthened with dressed stone slabs. The tomb’s façade has the same kind of shape panels in three rows running all around the four sides of the chamber arches in a series. Over the entire tomb comprise 56 arches and 28 square panels. The top and the lower rows are similar in shape and size, except the middle one in the upper series each (Pl. IV).

The tomb has access from all four sides through a doorway in the middle of each side. However, the doors on the north, south, and east have been replaced by iron windows as a later addition. The entrances are flanked by three such panels of the pointed sunk arches. The entrance is marked by a rectangular door frame of (0.91 × 1.76) m in an arched opening under the stone lintel. The dome itself denotes an interesting stage in the evolution of this important monument, in terms of its squat low shape, and style of construction.

As for as, the interior of the tomb is concerned, it is in admirable condition when the desire for enrichment is insatiable. Each wall is one meter wide in thickness and the walls have arranged an arcade of shallow arches and enclosed by a system. Another outstanding feature of this tomb building is the construction one and concerns the treatment of the interior of the central chamber. It is octagonal in shape and each octagonal side is comforted by a tall pointed alcove measuring (0.7 × 1.34 m). The octagon shape is transformed into a sixteen-sided structure through arched squinches. These squinches convert the lower chamber to around the base for the construction of the superstructure, which makes a circular base for the domical ceiling. On every octagon, an arch is constructed with a height of 3.3 m.

Niches were provided to the inner side of the tomb’s walls. Each side of the octagon is provided with two niches, of a size of 100×50 cm each. The floor is recently paved with modern cement plaster. But originally it was paved with large-sized bricks (*Chawka)* with a white marble cenotaph in the center marking the grave. The marble cenotaph measurement is 1.43 meters in length, 54 cm in width, and 54 cm high (Pl. II). This belongs to the Last Turkish ruler Sultan Mahmud Khurd the last Turkish ruler of the Pakhal Emirate (Muhammad 2015: 21). He had prepared it in his lifetime and wished to be buried under it, but he was not destined to be the inmate of this grave. During his campaign against the Yousafzai and other revolts, he went to Delhi to seek help from the Mughal ruler Āurangzeb̔ Ālamgīr against these insurgencies. On his return, he was martyred by the rebels at frontier

territories. Except for the throne bearers at the Dewan Raja Baba today there is no Turk family in the Guli Bagh area (Muhammad 2014: 123; Khan 1976: 371).

Biological and Environmental Threats

The whole monument was plastered with thick lime mortars as traces of which still survive on it. The ingredients of lime mortar are consisting of lime, gypsum, and fine sand, which are in contrast in type and amount. Bricks have been used not only for construction purposes but different arched designs were finished through these bricks.

The Tomb of Mehmud Khurd in Guli Bagh, Mansehra seems to us even today as admiration inspiring and thrilling heritage, but this monument of the glorious past is slipping away slowly and silently through the combined effect of biological and environmental agents, and now it is in imminent danger. Various continental compulsions like temperature, rainfall, moisture, erosion, earthquake, and other biological threats carry out the degradation of tomb buildings. Besides these threats, some other agents and terrorizations also create a lot of cracks vertically as well as horizontally in it.

These were due to frost action, frostiness, evaporation, wind action, water penetration, and wet and dry weathering conditions as well as fungus, etc. The worsening of bricks and lime mortar is a compound process by the interface between several interrelated features like;

The climatic conditions, urban pollution, and nature brick components lead to physical, environmental, and biological weathering (Schaffer 2004: 32). In these conditions plants and animals frequently contributed to this process of biological weathering and created much swelling to the built heritage, which directly predisposed the material of the monument (Pl. I).

Rainfall in District Mansehra is received throughout the year, which is about 1445 mm. Summer maximum rainfall is more as compared to the winter, because of the summer monsoon. Due to heavy rainfall in the monsoon and dense wind brought different kinds of vegetation seeds from surrounding areas. These seeds are grown in the building construction gaps and cause considerable cracks in the structure. The rainwater also penetrated and had vertical and horizontal transport of water inside the material by wind action and it is forced the bricks and lime plaster of the building causing severe cracks in the tomb. Mostly in the monsoon the thunderstorm and heavy rainfall in this area are the natural threat for the monument (Ajit 2013: 92) (Pl. III).

A number of Physical phenomena played their role in promoting the decay of the material; these actions are such as frost and the effect of moisture in causing swelling and cracks to the walls and dome of the tomb.

Furthermore, the monument is also exposed to sun rays and heat received from the sun (Insulation). The day temperature shoots up, the material expands, and at night temperature falls, and material contracts. As a result of this continuous change in the temperature fluctuation (expansion and contraction) the bricks as well as plaster of the tomb, expanded and swelling leads to cracks and is a creation of threat of the glorious monument (Pl. II).

Salt is also originally present in the mud material of bricks are to be formed, these salt are responsible for a good deal of the efflorescence, which are observed on the sliced bricks of the monument created more and more dangerous phenomena to the structure (Schaffer 2004: 56,72).

It is the matter of common observation that the action of fungous growth such as bacteria Fungus, living organism which contributed to the decay of material and although their action is, generally less important than certain of other harmful agents, this organism grew up on the northern and western side of the tomb has damaged some of the parts of the monument.

With vertical cracks, some horizontal cracks were also visible in the building and plaster is flaking at various places. Wild vegetation has been noticed over the walls of the tomb, which is not only defaced the grace and beauty of the monument but also cause to help in the disintegration of the structures. The local community due to unawareness also created an unfriendly environment to the tomb structure (Pl. IV).

The ground level on three sides is raised to about 1 meter in resulting blockage the drainage system of the monument and 8th rainy water is absorbed in the foundation of the structure.

The tomb received unprecedented destruction and was greatly distracted during the devastating earthquake that occurred on October 8, 2005. The walls of the Tomb are badly damaged due to ravages of time as well as due to restless disorder and at some places, the masonry is considerably pulled apart. Severe cracks both externally as well as internally are developed in the tomb of such damages partially noticed in the southwestern corner, top of the wall. Internally the floor and walls up to dado level are plastered with modern cement. The original binding agents are mud, which is very easy to deteriorate when the lime mortar is detached (Pl. V).

Conclusion

The biological and environmental impacts on the built heritage are a severe problem throughout the centuries. In old buildings, the binding agents are mostly mud or lime mortar. The saltation, raising of the water table, exposer to the wind and sun, and other natural hazards make it weakened for the growth of vegetation, without any proper care, as the under-discussed tomb building of Sultan Mehmud Khurd at Guli Bagh. We have examined so many severe threats, as occurred in the structure are creates cracks to a cause of major damages are mostly of environmental and biological and natural hazards as not to be addressed in time.

Bibliography

Ajit, K.S (2013) *Weather and climate (CLIMATOLOGY)* Kalyani Publisher, New Delhi.

Ali, T (1988) Anonymous Tombs in Gomal Valley, And the Beginning of Tomb Architecture in Pakistan.

______ (1993) Tomb of Sadan Shaheed, its decoration. *Ancient Pakistan (Peshawar) Vol 8*.

Amoroso,G.G (1983) Stone decay and conservation, Atmospheric cleaning, consolidation

Buchanan, R.M 1928 *The decay of stone in building and monuments: A biological problem.* British Association Report

Brown,P. (1942) *Indian architecture (Islamic Period)*, 3rd ed. Bombay.

Bahadur, K. (2001) *Tarikh-i- Hazara* (Urdu), 3rd ed. Abbottabad: Dar-ur- Shifa.

Bakri, H. (1992) *Khidmatsunnat Nabawia, Madina Munawara*,Vol. II, Madina.

Dani, A.H (1995) *Human records on Karakuram Highway*, Lahore.

Fodde, E (2007) Fired brick and Sulphate attack: The case of Mohenjo-Daro Pakistan, *Journal of Architectural Conservation*, *No 13*, *Vol 1*

Hagewald, J. (2007) Domes, Tombs, and Minarets: Islamic influence on Jaina Architecture. *The Temples in South Asia, Vol. 2*.

Hameed, A. (2012) Archaeological Potential of Mansehra (A case study based on Recent Explorations M.Phil Thesis, Un-publish).

Khan, B. (1969) *Tarikhi-i-Hazara* (Urdu), Lahore

Khan, I. M. (1976) *Tarikhi-i-Hazara* (Urdu), Peshawar.

Muhammad, F (2014) Guli Bagh Mansehra: An Archaeological Study (M.Phil Thesis, Un-publish)

Muhammad,F., Shakirullah (2015) Turk Rulers of Pakhli State, Mansehra, Pakistan, 2015, *Frontier Archaeology, Vol: V,* Peshawar

_________ (2014) GuliBagh: The last capital of Pakhli, Khyber Pakhtunkhwa, Pakistan 2014, *Pakistan Heritage Vol: VI,* Mansehra

Shakirullah (2012) Two rare monuments in District Mansehra, Khyber Pakhtunkhwa Province, *Pakistan Heritage, Vol.IV*, Mansehra.

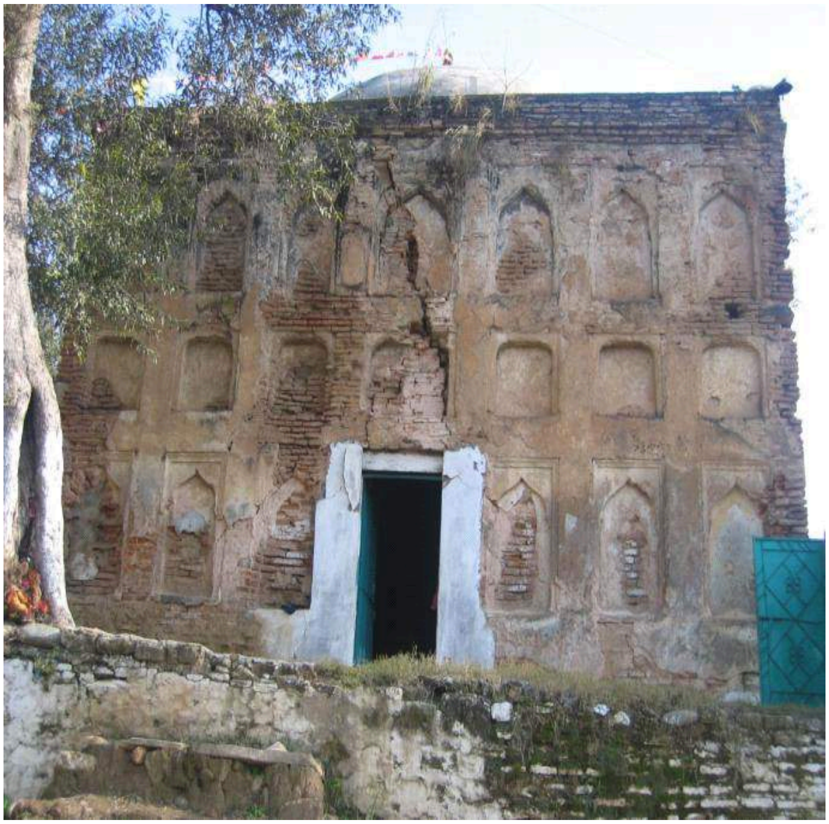

Pl. I: Guli Bagh: Close up of western doorway, showing crack up to the top of the dome, cement work on both sides of the door

Pl. II: Guli Bagh: Broken water shut the improper flow of rainwater and growth of fungus

Pl. III: Guli Bagh: Close up of Northern bastion showing cracks and missing parts

Pl. IV: Guli Bagh: Southern side showing modern gate, plasterwork, and Cracks

Pl. V: Guli Bagh: Detail of interior removed plaster badly damaged due to ravages of time

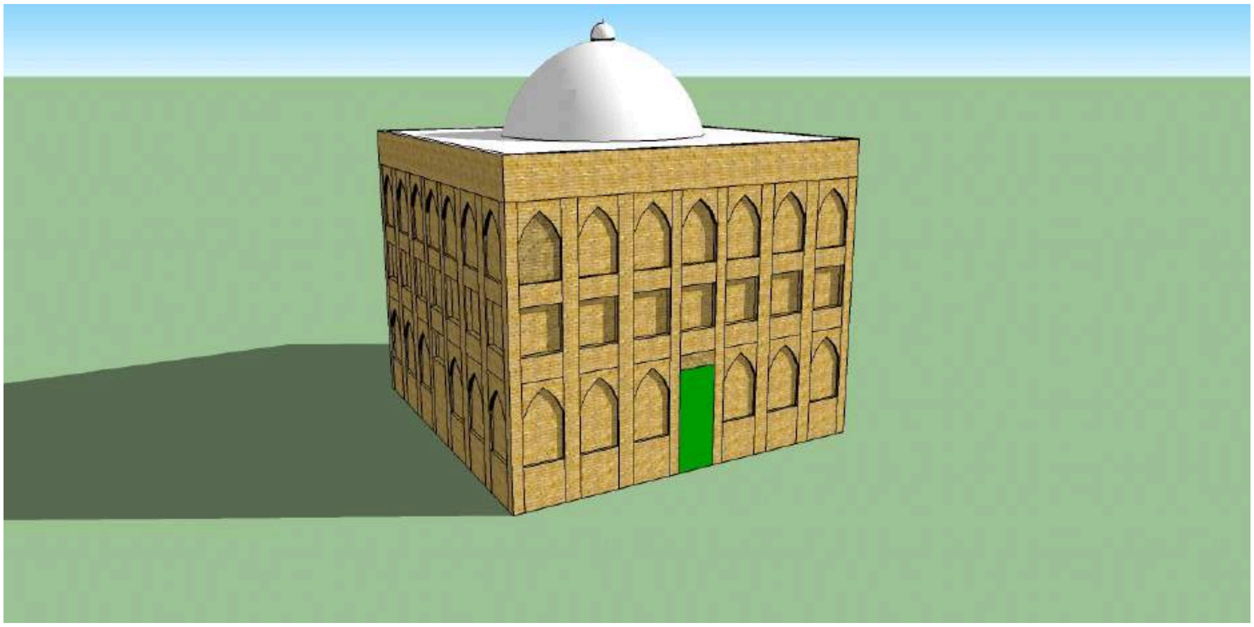

Fig. 1: Guli Bagh: Elevation of Sultan tomb with shadow

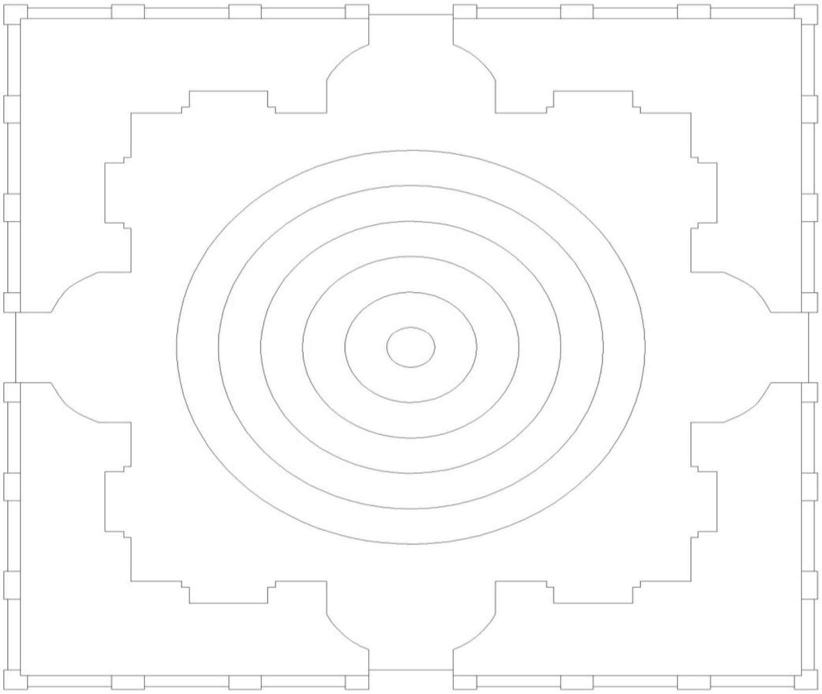

Fig. 2: Guli Bagh: Ground Plan of the Sultan's tomb

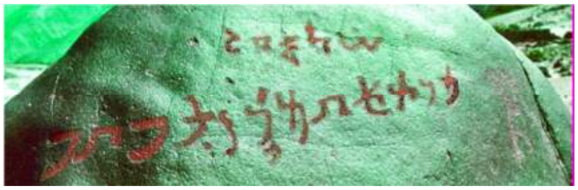

Gondophares inscription from Chilas

Guidelines for Contributors

Journal of Archaeohistorical Studies is aimed at archaeologists and historians with particular interests in advancing their knowledge about archaeohistory of the Old World. This quarterly journal publishes original research on socio-religious and socio-cultural evolution across the Old World throughout the archaeohistorical time scale. Evolving horizons of settlement patterns, shifting mobility networks, and religio-socio-economic changes reflected through artifactual, written or structural developments are the primary focus areas of ASAS Roads and Religions Research Initiative, a project responsible for initiating this research journal. Journal of Archaeohistorical Studies provides a forum for archaeologists, ethnoarchaeologists, historians, and experts in the field of comparative religion studies from different academic backgrounds who share a common interest in the above-mentioned fields. Journal of Archaeohistorical Studies seeks to invite scholars to contribute original and unpublished manuscripts for showcasing research advancement in one or more than one aspect of archaeohistorical interests mentioned above.

Scope and contents

JAHS features peer-reviewed original research and review articles written in any language concerning the archaeohistorical studies of any region in Asia, Europe, and Africa. Please provide two abstracts and keywords in English and the language of your manuscript.

Review policy and procedure

Accepted papers are peer-reviewed by at least two experts. Peer-reviewers are selected for their knowledge and expertise and may include *JAHS* Editorial or Advisory Board .

Manuscript

Manuscripts can go to any length but it is Chief Editor"s right to edit them to a smaller size. Double spacing is not required. Footnotes should be avoided generally but can be added if inevitable. Manuscripts submitted to the *JAHS* should be comprised of an article title, Author"s names and contact details. (It should also include) abstract of 150-250 words, up to 5 keywords, suitable for online search purposes.

Authors are required to prove evidence that the substance of the research paper"s content has not been published previously and is not currently being considered for publication elsewhere. Contributors are required to submit the manuscript including illustrations in the form of electronic files. Line drawings should be created at a minimum of 1200 dpi and photographs should be scanned in at a minimum of 600 dpi.

Permissions

Authors are requested to obtain permission to reproduce photographs, drawings, tables, and any other copyrighted material.

Illustrations or photographs downloaded from the Internet can (be) accepted if there is no copyright issue involved and reference to the web link is given.

References

References and short citations can be provided with any internationally accepted and practiced.

ISSN-L 2702-1858
PRINT ISSN 2702-1858
ONLINE ISSN 2702-1378

The Quarterly

AASAAR

JOURNAL
OF
ARCHAEOHISTORICAL STUDIES

No.4 Vol.2 October – December 2021

Published by
http://www.roadsandreligions.org/
***ASAS* Roads and Religions Research Initiative**
www.aasaar.org

ISSN-L 2702-1858
PRINT ISSN 2702-1858
ONLINE ISSN 2702-1378

The Quarterly

AASAAR

JOURNAL
OF
ARCHAEOHISTORICAL STUDIES

No.4 Vol.2 October – December 2021

Published by
http://www.roadsandreligions.org/
ASAS **Roads and Religions Research Initiative**
www.aasaar.org